
پہلا خط
طیبہ یونس

ناول

طیبہ یونس

پہلا خط

''سر جی! اس نے ہی اپنے سابق شوہر کا قتل کیا ہے۔ اب دیکھیں کیسے معصوم بن کر کھڑی ہے۔''

''میں نے۔ کچھ۔ نہیں۔ کیا۔'' وہ ہچکیاں لے کر بولی۔

''یہاں آ کر ہر کوئی یہی کہتا ہے۔'' لہجہ بہت سخت اور کڑوا تھا۔

کرسی پر بیٹھے شخص کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی۔ آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ایک فائل کھلی ہوئی تھی۔ اپنے دونوں بازو میز پر رکھ کر وہ اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو گھور رہا تھا۔

''سر کچھ پوچھ رہے ہیں۔ سچ سچ بتا کیوں اپنے شوہر کا قتل کیا؟ ورنہ میں اپنے طریقے سے پوچھوں گی۔''

لیڈی کانسٹیبل کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس کو

اس نے زور سے میز پر مارا۔

''اس کو ابھی تھانے میں بند کردو۔ اور ہاں صبح تک یہ اپنا جرم قبول کرلے۔'' انسپکٹر کامران اپنی کرسی سے اٹھا، اپنی کیپ سر پر پہنی، دروازے تک پہنچا اور واپس مڑا۔ کانسٹیبل کے کان میں کچھ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

لیڈی کانسٹیبل نے اس لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اس کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی۔ ایک اندھیرے کمرے میں اسے دھکا دے دیا، وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور منہ کے بل جا گری۔ کانسٹیبل نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی اور وہاں سے چلی گئی۔

پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی لائٹ نہیں تھی یا شاید وہ بند تھی۔ پورے جسم پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ ایک چھوٹے سے روشن دان سے چاند کی روشنی اندر آرہی تھی۔

اس نے دیوار کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی۔ کمزوری اور تکلیف کی وجہ سے اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حلق بھی خشک تھا۔ پیاس سے زبان اکڑ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔

پورے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ اندھیرے میں کچھ ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا۔ بس چاند کی ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔ روشن دان سے دور باہر ٹریفک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آنسو کا ایک ننھا سا قطرہ اس کی آنکھ سے نکلا۔

''یا اللہ۔ میری مدد فرما۔''

گہری سانس لی۔ کچھ دیر پہلے کا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو سختی سے جکڑ لیا۔

''سر! اس کو گرفتار کرلیں۔ اس ہی عورت نے قتل کیا ہے۔'' وہ عورت زور سے چلائی۔

آج پورا محلہ کھڑا اس گھر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ پولیس وین ان کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ تین چار پولیس والے ان کے گھر میں موجود تھے۔

وہ زور زور سے چلا رہی تھی کہ وہ بے قصور ہے۔ پر شاید قسمت نے اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ اس کے لیے سب دروازے بند ہو گئے تھے۔ نہ جانے کس کی نظر اسے لگ گئی تھی۔ پولیس والے اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ اس کے باقی گھر والے خاموش کھڑے تھے۔ سب کے چہرے اب اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

''یا اللہ میری مدد کر۔'' اس نے اپنا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ''یا اللہ۔ کاش یہ ایک ڈراؤنا خواب ہو۔''

اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھولیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ شاید چاند کے آگے بادل آ گئے تھے۔ اب اس کمرے سے اسے خوف آنے لگا۔

زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ تھانے کا نام اس نے صرف اخباروں، ٹیلی ویژن پر دیکھا یا سنا تھا۔ آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی تھی۔

اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کی سانسیں وہیں اٹک گئیں۔ کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جوتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ فوراً سمٹ کر بیٹھ گئی۔ کمرے کا بلب آن ہوا۔ ہزار واٹ کے بلب نے جیسے اس کی آنکھوں کی بینائی اس سے چھین لی ہو۔ اس نے اپنی آنکھیں فوراً موند لیں۔ دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔

''تم کو چاہیے تھا کہ دھیان رکھتی۔ بس تم نا ذمہ داری نہیں لینا چاہتی۔ مجھے کتنی بار کہنا پڑے گا۔''

''ساری غلطی میری ہے۔ جیسے آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ سارا الزام مجھ پر لگا کر

آپ خود اپنی ذمہ داریوں سے بری ہو جاتے ہیں۔ میں تنگ آ چکی ہوں اس آئے روز کی چخ چخ سے۔“ ہیئر برش ڈریسنگ سے اٹھا کر فرش پر پٹخا۔

”شاہدہ۔ میں تم پر الزام نہیں لگا رہا۔ بلکہ تم کو تمہاری ذمہ داری یاد کروا رہا ہوں۔“ اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر اچھالا۔ ”عورت کی پہلی ذمہ داری اس کا گھر ہے۔ تم ابھی ابھی پارلر سے لوٹی ہو، اور پھر اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا رہی ہو۔“ وہ بلند آواز میں دھاڑا۔

دونوں میاں بیوی کے لڑنے کی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ گھر کے سب افراد یہاں تک کہ نوکر بھی اپنے مالکوں کی لڑائی جھگڑے سے تنگ آ چکے تھے۔ ایک چیخ کر بولتا تو دوسرا اگلا پھاڑ کر جواب دیتا۔

”میں نے شادی سے پہلے تم سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ مجھ سے نہیں ہوتے گھریلو عورتوں والے کام۔“ شاہدہ بیگ بھی چیخی۔ ”تم سب مرد ایک جیسے ہوتے ہو۔ عورتوں کو بس پنجروں میں قید کر کے رکھنا آتا ہے۔ خود باہر جا کر عیش کریں۔ اور ساری روک ٹوک ہم عورتیں کے لیے۔ میں کسی گئے گزرے خاندان سے نہیں آئی کہ ساری زندگی تمہارے پاؤں کی جوتی بن کے گزار دوں۔ میرے دل میں جو آئے گا وہ میں کروں گی۔“ اپنے شوہر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

شاہدہ بیگ نے سبز رنگ کی بنا آستینوں والی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گلے میں ڈائمنڈ کا بے حد قیمتی نیکلس تھا۔ بالوں کو پارلر سے تین دن پہلے گولڈن رنگ کا ہیئر ڈائی کروایا تھا۔

”میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تم سے شادی کرنا تھا۔“ اپنی گردن سے ٹائی اتار کر دور پھینک دی۔ ”میں تمہاری طرح نہیں ہوں جو باہر جا کر عیش کروں۔ اپنے بچوں کے لیے محنت

کرتا ہوں۔ مجھے اپنی اولاد کی فکر ہے۔اور میری ایک بات تم کان کھول کر سن لو۔ یہ جو تم عیش کرتی ہو وہ سب میری کمائی ہوئی دولت کی وجہ سے ہے۔"شکیل رضا ہاشمی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔غصے سے اس کا چہرہ لال ہوگیا تھا۔ مسلسل اپنی بیگم کو گھور رہا تھا جو مزے سے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر نیل کلر لگا رہی تھی۔ بیشک وہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ پر وہ نیل پالش ہمیشہ خود لگاتی تھی۔

"یہ بار بار اپنی کمائی ہوئی دولت کا طعنہ مجھے نہ دیا کرو۔ تمہارے بچوں کو سنبھالتی ہوں۔ تم کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔"شاہدہ بیگ نے اپنے اوپر پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا۔ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔وہ جب بھی بولتی تیر کے طنز برساتی۔

پروفیسر شکیل رضا ہاشمی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔لاہور کے ایک پوش علاقے میں ان کا بہت بڑا بنگلہ تھا۔گھر میں کام کے لیے نوکر رکھے ہوئے تھے۔ان کی اپنی بیگم سے ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔

گیٹ پر ہارن کی آواز سنائی دی۔گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ناگواری سے لان میں کام کرتے مالی کی طرف دیکھا۔اس نے بھی ناک چڑھا کر چوکیدار کی طرف دیکھا۔چوکیدار نے بددلی سے گیٹ کھولا۔ایک برانڈ نیو کار اندر داخل ہوئی۔

گاڑی کا دروازہ کھولا، اندر سے ایک شخص باہر آیا۔اس کی عمر پینتیس کے قریب ہوگی۔دراز قد تھا۔کالے رنگ کا تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔سر کے بالوں کو جیل کی مدد سے پیچھے کی طرف سجایا ہوا تھا۔چہرے پر سن گلاسز موجود تھے۔اس کے ہاتھ میں ایک منی بریف کیس تھا۔اس نے پٹخ سے دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ لیتا اندر کی طرف چلا گیا۔گھر کے تمام لوگ اسے ناپسند کرتے تھے۔سوائے ایک شخص کے، جس کی وجہ سے وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر آجاتا تھا۔

گاڑی کا ہارن سن کر شاہدہ بیگ نے اوپر سے نیچے کی طرف جھانکا۔ اپنے شوہر پر نظر ڈالی، میز سے اپنا بیگ اٹھایا اور مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ کمرے سے باہر آتے ہی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

گھر کی ایک ملازمہ لیلیٰ باہر کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ڈسٹنگ والا کپڑا تھا۔ جس سے وہ اس کمرے کے باہر لگی بڑی سی پینٹنگ کو صاف کر رہی تھی۔ دبلی پتلی لیلیٰ نے ہمیشہ بالوں کا جوڑا کیا ہوتا تھا۔ لپ اسٹک بھی ہمیشہ سرخ رنگ کی لگاتی تھی۔

شاہدہ بیگ کو اس سے شدید نفرت تھی۔ جہاں کام نہیں ہوتا تھا، وہ وہاں موجود ہوتی تھی۔ شاہدہ بیگ نے کئی بار اس کو کام سے نکالا تھا۔ لیکن شکیل رضا کی وجہ سے وہ واپس کام پر آ جاتی کیونکہ لیلیٰ کی ماں نے کئی سال ان کے گھر کام کیا تھا۔ جس کی وجہ لیلیٰ کو اپنے صاحب کی خاص حمایت حاصل تھی۔

شاہدہ بیگ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے ایک لمحہ دیکھا، اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالا، پیروں میں پہنی ہائی ہیل کو ٹک ٹک کرتی زینے اتر کر نیچے آ گئی۔ ہال میں ثاقب بیگ کھڑا تھا۔

ثاقب بیگ نے اوپر سے نیچے تک اپنی بہن کو دیکھا اور اس کی طرف مسکرا کر نظر اچھالی۔

شاہدہ بیگ نے بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں آپس میں گلے ملے۔

”آج بہت حسین لگ رہی ہو؟“ ثاقب نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

”ایک تم ہو جو ہمیشہ میری تعریف کرتے ہو۔ اور ایک وہ ہے جس نے کبھی میری تعریف نہیں کی۔“ شاہدہ بیگ نے فوراً شکوہ کیا اور اوپر والی منزل پر بند دروازے کی طرف دیکھا۔

”میں تو ہمیشہ حسن کی تعریف کرتا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں جب خدا نے ایک چیز کو اتنا خوبصورت بنایا ہے، تو اس کی تعریف بندے کو لازمی کرنے چاہیے۔ یہ حسن تو ہے جس کی وجہ

سے دنیا اتنی دلکش اور رنگین ہے۔" ثاقب بیگ نے اپنے سن گلاسز اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھے اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔ منی بریف کیس کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

دونوں مین ہال میں بیٹھ گئے۔ بنگلے کا یہ حصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کھڑکیوں پر بہت مہنگے اور شاندار پردے لٹک رہے تھے۔ یہ سارے پردے شاہدہ بیگ نے خود جرمنی سے خریدے تھے۔ ہال میں ایک بہت بڑا شوکیس تھا۔ اس میں دنیا کے تمام ممالک سے خریدے گئے برتن موجود تھے۔ ٹی سیٹ، کیک سیٹ، کٹلری سیٹ۔ شاہدہ بیگ کی مختلف ہابی میں سے ایک برتن جمع کرنا تھا۔ صوفے بھی بے حد قیمتی لکڑی کے بنے تھے۔ تمام صوفوں کی ایجز پر چیتے کا منہ بنا ہوا تھا۔ درمیان میں موجود شیشے کی میز خاص آرڈر پر تیار کی گئی تھی۔ جس پر کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس سجے تھے۔

"تم کسی پارٹی میں جا رہی ہو؟ موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا کہاں ہیں۔" ثاقب بیگ نے اپنا دایاں ہاتھ آرم ریسٹ پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی انگلی چیتے کے سر پر گول گول پھیر رہا تھا۔

"دونوں ڈرائیور کے ساتھ فارم ہاوس گئے ہیں۔ شام کو دونوں کا اپنے بابا کے ساتھ سینما جانے کا پروگرام ہے۔ میں بھی ایک فرینڈ کی پارٹی میں جا رہی ہوں۔" شاہدہ بیگ کو اپنے دونوں بیٹوں کی بہت فکر تھی۔

دونوں باتوں میں مصروف تھے۔ لیلیٰ ثاقب بیگ کے لیے فریش جوس لے کر آئی۔ ٹھنڈا جوس کا گلاس شیشے کی میز پر رکھ دیا۔

"صاحب! آپ کے لیے کافی لاؤں؟" لیلیٰ نے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ شاہدہ بیگ کچھ کہتیں پیچھے سے آواز آئی۔

"ہاں بنا دو۔" شکیل رضا سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آ رہا تھا۔ اس نے کپڑے بدل لیے

تھے۔ٹراؤزر کے اوپر سادہ سی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''تم دبئی سے کب آئے ثاقب؟'' وہ بھی صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور ثاقب سے پوچھا۔ شاہدہ بیگ نے چبھتی نظروں سے لیلیٰ کو دیکھا۔وہ بنا پرواہ کیے کچن میں چلی گئی۔

''میں کل ہی دبئی سے لوٹا ہوں۔سوچ رہا ہوں ایک نئی فیکٹری کھول لوں اور۔۔۔''

''تم باتیں کرو مجھے کچھ کام ہے۔میں آفس میں جا رہا ہوں۔'' شکیل رضا نے ثاقب بیگ کی بات کاٹ دی۔گھر میں ایک چھوٹا سا آفس بنایا ہوا تھا۔وہ وہاں سے اٹھ کر ادھر جانے لگا۔

''بچوں سے ملاقات ہوئی۔'' ثاقب بیگ فٹ سے بولا۔

''ہاں۔''

''لاڈلا بیٹا کہاں ہے؟'' ثاقب بیگ اب بھی چھیتے کے سر پر اپنی انگلی پھیر رہا تھا۔اپنے بھائی کے اس سوال پر شاہدہ بیگ کھل کر مسکرائی۔اس سے پہلے شکیل رضا کچھ کہتے دوبارہ ہارن کی آواز سنائی دی۔موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا اندر بھاگتے ہوئے آئے۔دونوں بھائی پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔دونوں بچے آتے ہی اپنے باپ سے چپک گئے۔

''تم دونوں فریش ہو جاؤ۔میں ذرا سا کام پینڈنگ پڑا ہے، وہ دیکھ لوں پھر ہم مووی دیکھنے چلتے ہیں۔''

''ماما۔آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔'' موسیٰ رضا نے مسکرا کر اپنی ماں سے پوچھا۔

''نہیں۔صرف ہم تینوں جائیں گے۔آپ کی ماما کو اپنی فرینڈ کی پارٹی میں جانا ہے۔'' شاہدہ بیگ کی بجائے شکیل رضا نے جواب دیا۔اس کے چہرے پر غصے اور تکلیف کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔وہ شاہدہ بیگ تھی اس سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔ایک بار جو سوچ لیتی وہی کرتی۔موسیٰ رضا کا موڈ آف ہو گیا۔

شکیل رضا اپنے آفس میں چلے گیا۔عیسیٰ رضا نے التجائی نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔شاہدہ بیگ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا منہ لٹکا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔لیلیٰ کافی کا کپ ڈش میں رکھ کر ہال سے گزرتی ہوئی آفس میں چلی گئی۔

''ثاقب! کچھ بھی کرو۔میں اپنے بچوں کا حق کسی اور کو نہیں دوں گی۔ایسا نہ ہو میرے بچوں کا حق کوئی اور لے اڑے اور میں ہاتھ ملتی رہ جاؤں۔''شاہدہ بیگ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ملتے ہوئے بولی۔

''تم فکر مت کرو۔تم کو اور تمہارے بچوں کو ان کا حق مل کر رہے گا۔بس تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔''ثاقب بیگ منی بریف کیس کو ہاتھ میں پکڑ کر شیطانی مسکراہٹ لیے اپنی دونوں آنکھیں سکیڑ کر بولا۔

شاہدہ بیگ بھی مسکرائی۔اسے اپنے بھائی پر پورا بھروسہ تھا۔وہ اس کا ساتھ ضرور دے گا۔

''اس بریف کیس میں کیا ہے؟''شاہدہ بیگ کو تجسس ہوا۔

''بے حد قیمتی خزانہ۔جس کے لیے لایا تھا،وہ گھر پر نہیں۔کوئی نہیں اگلی بار سہی۔آؤ تم کو تمہاری فرینڈ کے گھر ڈراپ کر دوں۔''ثاقب بیگ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔اپنے سن گلاسز دوبارہ پہن لیے اور باہر کی طرف نکل گیا۔شاہدہ بیگ نے آفس کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔اپنے ہاتھ کی مٹھی بنائی،اپنا پرس لیا اور ثاقب کے پیچھے چلی گئی۔

☆......☆......☆

آسمان آج شدید کالا تھا۔صبح ہو گئی تھی پر ابھی تک بارش تھمی نہیں تھی۔بجلی اب بھی چمک رہی تھی۔ٹھنڈی ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں۔

جہاں بے تحاشا لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔وہاں کچھ فرد ایسے بھی تھے،جنہیں اپنا کام ہر

صورت کرنا تھا۔ جن کا گھر پاس تھا یا نزدیک تھا ان کے لیے آسانی تھی۔ پر جن کا گھر اپنی منزل سے دور تھا۔ ان کو مشکل تو ہوتی تھی۔ پر اللہ کے سچے لوگ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ مؤذن وقت مقررہ پر اذان دینے مسجد پہنچ گئے اور تمام مسجدوں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آواز آنے لگی۔

وہ تو پہلے سے جاگ رہی تھی۔ نیند تو اب اکثر اسے آتی نہیں تھی۔ اپنی چارپائی سے اٹھ کر پیر زمین پر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنا دوپٹہ درست کیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

اذان پورے دھیان سے مکمل سنی۔ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ چارپائی سے اٹھی، اپنی جوتی پہنی۔ جوتی کا ایک سٹریپ ٹوٹا ہوا تھا۔ جوتی پہن کر غسل خانے میں گھس گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے کا پینٹ جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ فرش سیمنٹ کا بنا ہوا تھا۔ کمرے کے ایک طرف چارپائی لگی ہوئی تھی۔ اس کے دوسری طرف ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی شیشے کی تھی۔ اس کا ایک پٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ٹھنڈ اندر کو آ رہی تھی۔ چارپائی کے نیچے لوہے کا ٹرنک تھا۔ جس پر مٹی کی دھول جمی تھی۔ چارپائی کے ساتھ پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر دوائیوں کے چند نسخے پڑے تھے۔ ایک پرانی گھڑی تھی۔ جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میز کے پاس لکڑی کی ایک خستہ حال الماری تھی۔ جس میں اس کے کپڑے موجود تھے۔ الماری کے اوپر قرآن شریف، جائے نماز، تسبیح اور چند اسلامی کتابیں موجود تھیں۔ الماری کے نیچے والے خانے میں ایک رس کا پیکٹ تھا۔ ایک اور شاپر کے اندر تھوڑے سے کچے چاول اور ذرا سی دالیں تھیں۔ کچھ پرانے اخبارات بھی پڑے ہوئے تھے۔ چارپائی کے پیر والی طرف زمین پر گیس والا سلنڈر پڑا تھا۔ سیمنٹ والی شیلف پر چند ضرورت والے برتنوں کے ساتھ، چند مسالے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بیسن لگا ہوا تھا۔ بیسن

کے ساتھ ہی واش روم کا دروازہ تھا۔

سردی کی وجہ سے کمرے میں بہت ٹھنڈ تھی۔واش روم کا دروازہ کھلا، وہ باہر آئی۔سردی سے بچنے کے لیے ایک سویٹر پہنا ہوا تھا۔لکڑی کی الماری سے جائے نماز اٹھا کر بچھایا۔نماز ادا کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔بارش کے چھینٹے کمرے میں آ رہے تھے۔وہ ان سب کی پرواہ کیے بغیر اپنی نماز میں مگن تھی۔

نماز ادا کرنے کے بعد ادھر جائے نماز پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔تسبیح ہاتھ میں لیے، اس کی انگلیاں مسلسل تسبیح کے دانوں پر پھر رہی تھیں۔بادل زور سے گرجے۔تیز ہوائیں بارش کے قطروں کو لیے کھڑکی کے راستے اندر کو آنے لگیں۔

اپنی تسبیح مکمل کرنے کے بعد وہ زمین سے اٹھ گئی۔جائے نماز اٹھا کر الماری میں واپس رکھا۔الماری سے قرآن شریف لیا، چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔وہ کافی دیر تک قرآن کا مطالعہ کرتی رہی۔قرآن مجید پڑھنے کے بعد اسے واپس اس ہی جگہ رکھ دیا۔

اسے اب ٹھنڈ لگنے لگی۔الماری سے اپنا پرانا دوپٹہ نکال کر اسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے آگے لگا دیا۔اس سے کمرے کے درجہ حرات میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا۔

گھڑی پر ٹائم دیکھا۔صبح کے تقریباً ساڑھے سات بج رہے تھے۔ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا۔آسمان سیاہ کالا تھا۔سامنے والا گراؤنڈ پانی سے بھرا ہوا تھا۔سرد ہواؤں سے عجیب خوف ناک آوازیں آ رہی تھیں۔

”نہ جانے ساری چڑیاں کہاں چھپ کر بیٹھی ہوں گی۔“وہ اپنے منہ میں بڑبڑائی۔وہ روزانہ چڑیوں کو کھانا ڈالتی تھی۔”لگتا ہے آج کام سے بھی چھٹی کرنا پڑے گی۔اگر شام تک بارش ختم ہوگئی، تو کام پر چکر لگا لوں گی۔“

وہ واپس اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ الماری میں دودھ کا ڈبہ پڑا تھا۔ چائے پینے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ سلنڈر بھی ختم ہونے والا تھا۔ اپنے اوپر رضائی لی، آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ نماز وہ باقاعدگی سے پڑھتی، گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھ کر تسبیح پڑھتی، قرآن مجید بھی پڑھتی تھی۔ بس دعا مانگنا نوری بی نے چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

''فزکس کے سر کے بارے میں ایک بات بولوں۔ کسی کو بتاؤ گی تو نہیں۔'' عینی ڈرتے ڈرتے بولی۔

''کیا بات ہے؟'' ستارہ نے حیرت سے پوچھا۔ سکول کی اسمبلی ابھی ختم ہوئی تھی۔ دونوں کلاس روم میں موجود تھیں۔

''یہ جو فزکس کے سر ہیں نا۔'' عینی نے آس پاس نظر دوڑائی۔ کچھ سٹوڈنٹ باتوں میں مصروف تھیں، تو کچھ آنے والے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ دھیرے سے ستارہ کے کان میں دوبارہ بولی۔ ''وہ مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے۔ وہ بہت عجیب طریقے سے۔ میرا مطلب ہے، چھوتے ہیں۔''

''مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔'' ستارہ نے ماتھے پر بل ڈال کر معصومیت سے پوچھا۔

''وہ کبھی میرے گالوں کو چھوتے ہیں۔ تو کبھی میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں۔''

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ سکول کی بیل بج گئی۔ پہلا پیریڈ میتھ کا تھا اور آج اس کا ٹیسٹ تھا۔ میڈم بس کلاس میں آنے والی تھیں۔

''اپنے اپنے پیپرز تیار کر لو، میڈم بس آنے والی ہیں۔'' یہ کلاس کی مانیٹر فاطمہ کی آواز تھی۔ ہر بار کلاس میں فرسٹ آتی تھی۔ اس لیے تمام ٹیچرز کی فیورٹ تھی۔ پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی

ستارہ نے فاطمہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"ٹیسٹ تیار ہے۔ستارہ۔" عینی نے اپنے بیگ سے کتاب نکالتے ہوئے پوچھا۔وہ کافی پریشان تھی۔

"نہیں۔ٹیسٹ تیار نہیں ہے۔" ستارہ کی آواز بمشکل نکلی۔"مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ مس نے میتھ کی ایکسر سائز کے مشکل سوالات حل ہی نہیں کروائے تھے۔اتنی مشکل ہو رہی تھی انہیں حل کرنے میں۔"

"میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔آج تو ٹیچر عظمیٰ ہمیں جان سے ماردیں گی۔" عینی کے چہرے کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔

"جن سٹوڈنٹس نے فیس جمع نہیں کروائی وہ سامنے آجائیں۔" مس شیلا کلاس میں داخل ہوئیں۔انہوں نے ایک رجسٹر اٹھایا ہوا تھا۔

عینی کے ساتھ دو اور لڑکیاں کھڑی ہوئیں جنہوں نے فیس جمع نہیں کروائی تھی۔

"ہاں تم تینوں نے کب فیس جمع کروانی ہے؟" مس شیلا جب بھی بولتی ناک چڑھا کر بولتیں۔"میڈم روز کل۔کل۔کل۔کب جمع کروانی ہے فیس؟ آج کا کیا بہانہ ہے؟"

"امی کہہ رہی تھیں دو تین دن تک جمع کروادیں گے۔ابھی پیسے نہیں ہیں۔"

"کھا،کھا کر تم موٹی بھینس بن گئی ہو اور فیس جمع کروانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ہر دوسرے دن ایک ہی بہانہ۔" مس شیلا نے پہلے عینی کا کان کھینچا پھر ہاتھ میں پکڑے رجسٹر سے اس کے سر پر زور سے تین چار بار مارا۔پوری کلاس میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

"کل تک فیس جمع نہیں کروائی تو دیکھنا تمہارا کیا حشر کرتی ہوں۔" مسز شیلا نے اب اس کی چوٹی زور سے کھینچی۔عینی کے آنسو نکلے پر حلق سے آواز نہ آئی۔

ستارہ اور عینی دونوں آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھیں۔ستارہ نے اس ہی سال سکول میں ایڈمیشن لیا تھا۔عینی اس سکول میں پہلے سے پڑھ رہی تھی۔اس کے والد صاحب اس دنیا میں نہیں تھے۔اس کی والدہ لوگوں کے کپڑے سی کر گزرا کرتی تھیں۔اس ہی وجہ سے اس کی فیس اکثر دیر سے آتی تھی۔عینی کا رنگ کالا تھا اور وہ موٹی تھی۔

مس شیلا اسے اکثر بھینس کہتی تھیں۔جس کی وجہ سے کلاس کی کچھ لڑکیاں بھی اس کا مذاق اڑانے لگی تھیں۔مس شیلا نے باقی دو لڑکیوں کو بس گھور کر دیکھا اور کلاس سے نکل گئیں۔

عینی واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔اس سے پہلے کہ ستارہ اس سے کچھ کہتی میتھ کی مس عظمیٰ کلاس میں آ گئیں۔اپنا بیگ رکھا،چاک اٹھایا اور بلیک بورڈ پر سوال لکھے۔

"آپ سب کے پاس بیس منٹ ہیں۔"لہجہ بڑا سخت تھا۔

مس عظمیٰ اپنی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئیں۔جن سٹوڈنٹس کو ٹیسٹ آتا تھا۔انہوں نے فوراً حل کر لیا۔کچھ لڑکیاں یونہی بیٹھی رہیں۔ستارہ بھی ان میں سے ایک تھی۔جیسے ٹائم ختم ہوا۔مس عظمیٰ نے کلاس کی مانیٹر سے کہہ کر سب کے ٹیسٹ کولیکٹ کروائے۔مس ٹیسٹ چیک کرنے بیٹھ گئیں۔ستارہ کے چہرے کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔تقریباً دس منٹ میں ٹیچر نے سب کے ٹیسٹ چیک کر لیے۔

"میں جن کے نام بولوں وہ سٹوڈنٹ کھڑی ہو جائیں۔"مس نے عینک کے پیچھے سے پوری کلاس پر نظر دوڑائی۔

ستارہ کے ٹیسٹ میں کم نمبر تھے۔مس نے سب کے ٹیسٹ واپس کیے۔اپنے ہاتھ میں ایک بڑی سے چھڑی لی۔جن لڑکیوں کے کم نمبر تھے۔ان کے دونوں ہاتھوں پر دس دس ڈنڈے مارے۔سب سے برا حال ستارہ کا کیا۔

”میں نے اپنی زندگی میں اتنی نالائق لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ کتنے کم نمبر آئے ہیں تمہارے۔ میری بات یاد رکھنا تم کبھی اپنی زندگی میں کچھ نہیں کر پاؤ گی۔“ مس عظمیٰ نے ستارہ کا کان اتنی زور سے مروڑا کہ وہ رونے لگ گئی۔ ”یہ مگرمچھ کے آنسو میرے سامنے مت بہاؤ۔ نالائق لڑکی۔“

ستارہ روتی ہوئی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ عینی بھی خاموش تھی۔ مس عظمیٰ غصے کی بہت تیز تھیں۔ جن کے نمبر کم آئے تھے، وہ بیل بجنے تک ان لڑکیوں پر اپنا غصہ نکالتی رہیں۔ ان کی انسلٹ کرتی رہیں۔ خدا خدا کر کے پیریڈ ختم ہوا اور مس کلاس سے چلی گئیں۔

”کتنے نمبر آئے ہیں تمہارے؟“ عینی نے ستارہ کا ٹیسٹ پکڑ کر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی اس کے چالیس میں سے سینتیس نمبر آئے تھے۔

”اللہ بچائے ان جیسے استادوں سے۔ نہ جانے کیا دیکھ کر ان کو نوکری پر رکھا جاتا ہے۔ میتھ تو تمہارا فیورٹ سبجیکٹ ہے۔ اور تین نمبر کم آ گئے تو کیا ہو گیا؟“ عینی ستارہ کو دلاسہ دینے لگی۔

”مجھے اب اس سبجیکٹ سے نفرت ہونے لگی ہے۔ اس ٹیسٹ کے چکر میں، میں نے فزکس کا کام نہیں کیا۔ اب ان سر سے علیحدہ بے عزتی ہو گی۔ اور اوپر سے اردو کی میم نے اتنا زیادہ ہوم ورک دے دیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ اس سکول میں لائق اور نالائق بچوں میں بہت زیادہ فرق کرتے ہیں۔“ ستارہ سسکیاں لے کر بولی۔

”اردو کی ٹیچر بہت غصے والی ہیں۔ جب وہ اردو کی تشریح کرتی ہیں۔ میرے کچھ پلے نہیں پڑتا۔ ان کی کچھ فیورٹ سٹوڈنٹ ہیں بس وہ ان ہی سے ہنس کر بات کرتی ہیں۔ اور اگر ہمیں جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور ان سے دوبارہ پوچھ لیں۔ تو وہ الٹا ہمیں مارنے لگتی ہیں کہ پہلے

تمہارا دھیان کدھر تھا۔ مجھے تو سب ٹیچرز برے لگنے لگے ہیں۔"

"ہاں۔ تم سچ کہہ رہی عینی۔ مجھے ٹیچرز سے کیا اب تو پڑھائی سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔ ہمارے گھر والے بھی ہمیں نہیں سمجھتے۔ ان کو لگتا ہے ساری غلطی ہماری ہے۔ ہم پڑھائی پر دھیان نہیں دیتے۔ مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ بڑا بھائی نہیں مانتا۔ کہتا ہے جب سکول جاتی ہو تو ٹیوشن کی کیا ضرورت۔ پہلے ہی تمہاری اتنی فیس دیتے ہیں۔ جب ٹیچرز اتنے سخت ہوں گے۔ ہم سٹوڈنٹس کا کیا حال ہوگا۔ جنہوں نے ٹیوشن رکھی ہے ان کے نمبر اچھے آتے ہیں۔ باقی لڑکیاں تو جیسے ڈھیٹ بن گئی ہیں۔ روز مار کھا لیتی ہیں۔ مس عظمیٰ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔" ستارہ ٹوٹے دل سے بولی۔

"ایسے مت کہو۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میں اپنی آپی سے میتھ سیکھتی ہوں۔ تم میرے گھر کے پاس رہتی ہو تم میرے گھر آجایا کرو۔ وہ بہت اچھا پڑھاتی ہیں۔" عینی فوراً بولی۔

دونوں سہیلیاں ستارہ اور عینی کلاس روم میں سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چند ماہ پہلے ستارہ کو اپنے گھر کے ساتھ سکول بھی بدلنا پڑا۔ پرانے سکول میں اس کا شمار لائق ترین سٹوڈنٹس میں کیا جاتا تھا۔ جب سے وہ اس سکول میں آئی تھی۔ اس کا شمار کلاس کے سب سے نالائق ترین سٹوڈنٹ میں ہونے لگا تھا۔

اگلا پیریڈ اردو کا تھا۔ میڈم فوزیہ بڑا سا چشمہ سر پر لگائے کلاس روم میں داخل ہوئیں۔ روزانہ کی طرح انہوں نے پہلے سبق پڑھایا اور پھر ہوم ورک چیک کرنے لگیں۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ شعروں کی تشریح خود ہیلپنگ بک سے دیکھ کر پڑھاتیں۔ اور سٹوڈنٹس کو ہوم ورک دیتیں کہ شعروں کی تشریح اپنے پاس سے کر کے لاؤ۔ جو سٹوڈنٹس نہیں کر پاتیں، وہ ان کی خوب درگت بناتیں۔ اور کوئی جو ٹیسٹ میں فیل ہوجائے تو پوچھو مت۔

”اپنا ہوم ورک نکال کر ڈیسک پر رکھیں۔ میں ابھی سب کا کام چیک کرتی ہوں۔“ میڈم فوزیہ نے سر سے عینک اتار کر اپنے چہرے پر لگائی۔ لال رنگ کا مارکر اپنے پرس سے نکالا۔ سب کی کاپیز ان کے ڈیسک کے پاس جا کر چیک کرنے لگیں۔

پہلا زور دار تھپڑ سدرہ کو پڑا۔ ستارہ اور عینی دونوں کے حلق خشک ہو گئے۔ میڈم کے چلانے کی آواز پوری راہداری میں گونجنے لگی۔

”یہ کیا لکھا ہے تم نے؟ میں نے تم کو یہ پڑھایا تھا۔“ سدرہ کو دو تین تھپڑ اور پڑے۔ جس جس کا ہوم ورک ان کمپلیٹ تھا۔ میڈم نے تو جیسے اپنے بچپن کا غصہ ان پر نکال دیا۔ ستارہ کی اردو کی ہینڈ رائیٹنگ اتنی اچھی نہیں تھی۔ اس کا ہوم ورک بھی مکمل نہیں تھا۔ میڈم نے اس پر بھی تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ ادھر ہی نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”پہلے خود نہیں پڑھتے۔ بعد میں والدین کو لے آتے ہیں کہ ٹیچر نے ہمیں ٹھیک سے نہیں پڑھایا۔ جن لڑکیوں کے اچھے نمبر آتے ہیں۔ کیا ان کے سر میں دو دماغ لگے ہوئے ہیں۔“ میڈم فوزیہ کا اشارہ ان کی پسندیدہ سٹوڈنٹ کی طرف تھا۔ ”کان کھول کر سب سن لو۔ کل اردو کا ٹیسٹ ہوگا۔ جن کے نمبر کم آئے بس سمجھ لینا وہ اپنی قبر تیار رکھیں۔“ میڈم نے کھا جانے والی نظروں سے پوری کلاس کو گھورا۔ بلیک بورڈ پر ٹیسٹ کی ڈیٹیل لکھی۔ پیریڈ ختم ہوا، اپنا پرس پکڑا اور کلاس سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

”ہائے، اتنا لمبا ٹیسٹ، ایک دن میں کیسے تیار ہوگا؟ باقی سبجیکٹ کا بھی ہوم ورک کرنا ہوتا ہے؟ اگر ٹیسٹ میں فیل ہوئے تو واقعی میڈم ہماری جان نکال دیں گی؟“ پوری کلاس اس ہی ٹاپک پر بات کر رہی تھی۔

”میں سوچ رہی ہوں کل چھٹی کرلوں۔“ اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی۔ ڈھکن کھول کرایک گھونٹ پانی پیا۔ پانی حلق سے اترتے ہی کچھ سکون ملا۔ کھڑکی سے باہر کھلے آسمان پر اڑتی ہوئی چڑیوں پر نظر پڑی۔

”ستارہ! سوچنا بھی مت۔ میڈم کل کا بدلہ پرسوں لیں گی۔“ عینی نفی میں سرہلاتے ہوئے بولی۔

”آپ میں سے عینی کون ہے؟ تمہیں فزکس کے سربلا رہے ہیں۔“ جماعت نہم کی ایک لڑکی نے آکر پیغام دیا۔

عینی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سکول کا یونیفارم پہنے سر پر سکاف لیے وہ ادھر ہی بت بن گئی۔ اس کی آنکھوں میں خوف نظر آرہا تھا۔ پوری کلاس اپنے کام میں مگن تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ سر تمہیں بلا رہے ہیں۔“ ستارہ نے عینی کو جیسے نیند سے جگایا ہو۔ عینی کی دونوں آنکھیں نم ہوگئیں۔ مردہ دل سے اٹھی، چھوٹے چھوٹے قدم لیے وہ کلاس سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

وہ سوئمنگ پول سے نہا کر باہر نکلا۔ اپنا باتھ روب پہنا، جوس کا گلاس ہاتھ میں لے کر ادھر سوئمنگ پول کے پاس ہی کرسی پر بڑی سی چھتری کے نیچے بیٹھ گیا۔ جوس کا ایک سپ لیا۔ اس کی نظر گولڈن رنگ کے بالوں والی لڑکی پر تھی۔

”کمینے۔ کسی کو تو چھوڑ دیا کر۔“ پینٹ شرٹ پہنے اس کا ہم عمر اس کے پاس والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔

”میری نظر سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ جس دن ایسا ہوا یار جمال، وہ میرا آخری دن ہوگا۔“ ثاقب کمینوں کی طرح ہنسا۔

”وہ تو میں اچھے سے جانتا ہوں۔ یہ سب تو چلتا رہے گا۔ یہ بتا کیسا ہے؟ اور پاکستان سے

کب لوٹا۔" جمال کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"ابھی صبح آیا ہوں۔باقی تو سب ٹھیک ہے بس یہ دبئی کی گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" خالی گلاس میز پر رکھا۔

"گرمی برداشت نہیں ہوتی۔اور باقی سب۔" جمال آنکھ مار کر بولا۔

"ہاہاہا۔اس کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔"

"اب یہ بتا مجھے اتنا ارجنٹ کیوں بلایا۔لگتا ہے دماغ میں کچھ چل رہا ہے۔" جمال اب سنجیدہ تھا۔

"ہاں۔کچھ نہیں، بہت کچھ چل رہا ہے۔پر یہاں نہیں کہیں اور جا کر بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے آج رات پہلے تجھے ایک خاص جگہ لے کر جاؤنگا۔پھر میرے گھر چلنا۔وہاں بات کریں گے۔تجھے کسی خاص سے ملوانا ہے۔اب کی بار فرینچ ہے۔" جمال بہت رازداری سے بولا۔

"اب بس رات ہونے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ابھی میں ہوٹل چلتا ہوں۔شام کو ملیں گے۔" ثاقب ہاتھ مسلتے ہوئے شیطانی لہجے میں بولا۔

جمال سے کچھ دیر بات کرنے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ثاقب نے ویٹر کو آرڈر دیا۔اپنا باتھ روب اتارا، دوبارہ سوئمنگ میں گھس گیا۔کچھ دیر نہانے کے بعد اپنے ہوٹل کے روم میں آ گیا۔واش روم گھسا، فریش ہوا۔

کالی پینٹ کے ساتھ پستہ رنگ کی فل بازو شرٹ پہنی۔اپنے سوٹ کیس سے برانڈڈ گھڑی نکال کر پہنی۔شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سیٹ کیے۔بالوں پر جیل لگایا۔اپنے اوپر پرفیوم چھڑکا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔دروازہ کھولا باہر ویٹر تھا۔اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔اسے کچھ پیسے دیے۔

"مجھے اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟" کھڑکی سے باہر سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کیا۔"وہ جو چہرے پر سن ماسک لگائے سوئمنگ پول کے پاس لیٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر۔"پیسوں کو دیکھ کر ویٹر نے ہامی بھر لی۔"سر کوئی اور خدمت؟"

"نہیں۔ضرورت پڑے گی تو کہہ دوں گا۔بس مجھے اب ڈسٹرب مت کرنا۔"

ویٹر کے جانے بعد ثاقب صوفے پر بیٹھا۔اپنی کافی میں دو چمچ چینی مکس کی۔اپنی بائیں ٹانگ کو اپنی دائیں ٹانگ رکھ کر سکون سے بیٹھ کر اپنی کافی پی۔اس کا بایاں پیر مسلسل ہل رہا تھا۔اس کا مطلب دماغ کسی گہری سازش میں لگا ہوا تھا۔

اپنی کافی ختم کی،کھڑکی کے پردے کھول دیے۔اپنے سوٹ کیس سے کچھ اہم ڈاکومنٹس اور تصویریں نکالیں۔انہیں بڑی احتیاط سے بیڈ پر پھیلا کر رکھ دیا۔ایک ایک ڈاکومنٹ کا بغور جائزہ لیا۔ان سارے پیپرز اور ڈاکومنٹس کو ایک بیگ میں ڈال دیا۔صوفے سے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنا،بیگ ہاتھ میں لیا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

آج سارا دن موسم کافی گرم رہا تھا۔پچھلے چند دنوں سے گرمی مسلسل بڑھ رہی تھی۔اس گرمی سے بچنے کے لیے لاہور کے ایک شاندار گھر میں مالی اپنے لان میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ان پھولوں سے اٹھتی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

اس ہی گھر کے کچن میں شام کی پارٹی کے لیے کھانے پک رہے تھے۔گھر کے دونوں چھوٹے بیٹے موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا اپنے کمرے میں ویڈیو گیم کھیلنے میں مصروف تھے۔شاہدہ

بیگ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ کر اپنے ناختوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ بالوں پر رولز لگائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی سہیلیوں کو اپنے گھر پر پارٹی کے لیے انوائٹ کیا تھا۔ ٹائٹ ٹراؤزر کے اوپر ہاف بازو کرتی پہنی ہوئی تھی۔

شکیل رضا واش روم میں شاور لے رہے تھے۔ ان کو ایک میٹنگ میں جانے کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ اس گھر میں زیادہ دیر تک خاموشی نہیں رہتی تھی۔

"تیمور! کیا ہوا؟ کیوں چیخ رہے ہو؟ کیوں پورے گھر کو سر پر اٹھایا ہوا ہے۔"

"آپ سے ہزار بار کہا ہے۔ ان دو کوڑی کے نوکروں کو میرے کمرے میں نہ بھیجا کریں۔ مجال ہے جو کبھی کوئی کام ڈھنگ سے کر لیا کریں۔" تیمور کے چلانے کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ "پچھلے پندرہ منٹ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے ابھی کباب چاہئیں۔ مگر کوئی میری بات نہیں سن رہا۔ میرے فرینڈز آئے ہوئے ہیں۔"

"جینا حرام کر رکھا ہے تم باپ بیٹے نے میرا۔ میں دو پل سکون سے نہیں گزار سکتی اس گھر میں۔" شاہدہ بیگ نے ہاتھ میں پکڑی نیل پالش فرش پر پٹخ دی۔ نیل پالش کی شیشی ٹوٹ گئی۔ سارے فرش پر نیل کلر پھیل گیا۔

"تو چلی جائیں، کس نے روکا ہے۔" تیمور دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اپنی بکواس بند رکھو یہ میرا گھر ہے۔ اور آئندہ سے مجھ سے تمیز سے بات کرنا ورنہ۔۔۔" اپنی شہادت کی انگلی دکھا کر وارننگ دی۔

"ورنہ کیا۔" وہ پوری بدتمیزی پر اتر آیا۔ "شاہدہ بیگ صاحبہ، کیا بگاڑ لیں گی میرا؟"

"تیمور! تمیز سے بات کرو۔ اپنی ماں سے کس طرح بات کر رہے ہو؟" پروفیسر شکیل رضا کی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ سر کے بال گیلے تھے۔ ان

کے پیچھے لال رنگ کی لپ سٹک لگائے لیلیٰ بھی اوپر آئی۔

"آپ بھول رہے ہیں یہ میری ماں نہیں ہے۔ مجھے کتنی بار آپ کو یاد دلوانا ہوگا۔" اپنے باپ سے بھی اس ہی لہجے میں بات کی۔ "میرے فرینڈز کے لیے میرے روم میں کباب بھیج دو۔" لیلیٰ کو حکم دیا، اپنے کمرے گیا اور دروازہ زور سے بھیج دیا۔

"دیکھا کتنا بدتمیز ہوگیا ہے۔ مجھ سے کس طرح بات کر رہا تھا؟" شاہدہ بیگ اپنے شوہر پر برس پڑی۔ "کیا یہ عزت ہے میری اس گھر میں۔ اور تمہیں ہمیشہ میری غلطی دکھائی دیتی ہے۔"

"اچھا میں بات کرتا ہوں اس سے۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ ابھی مجھے ایک ضروری میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ رحمت خاں آئیں گے تو خود سنبھال لیں گے۔" پروفیسر شکیل رضا کے چہرے پر پریشانی کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اچھے سے جانتے تھے شاہدہ بیگم اس وقت فل غصے میں ہیں۔ انہوں نے وہاں سے خاموشی سے جانا ہی بہتر سمجھا۔ لیلیٰ بھی فوراً کچن میں گھس گئی۔ اگر وہ ایک منٹ بھی وہاں اور رکتی تو شاہدہ بیگ اپنی توپ کا رخ اس کی طرف کر لیتی۔ شاہدہ بیگ اپنا پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پروفیسر شکیل رضا کی پہلی بیگم کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے دوسری شادی اپنی کولیگ شاہدہ بیگ سے کی۔ تیمور ان کی پہلی بیگم میں سے تھا۔ دوسری بیگم سے ان کے دو بیٹے موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا تھے۔ شاہدہ بیگ اور تیمور کی کبھی بھی آپس میں نہیں بنی تھی۔ شاہدہ بیگ شروع سے ہی اپنے دوستوں اور پارٹیز میں بزی رہی تھی۔ اس نے اپنی سگی اولاد کے لیے میڈ رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک اچھی ماں کبھی نہیں بن سکی تھی۔ شکیل رضا نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ پر اس عورت کو اپنا سوشل سرکل زیادہ عزیز تھا۔ جس کی وجہ سے گھر کا سارا نظام خراب ہوگیا تھا۔ پروفیسر شکیل رضا خود اپنی جاب کے سلسلے میں بہت بزی رہتے تھے۔ وہ بھی تیمور کو بہت کم ٹائم

دیتے تھے۔

شکیل رضا ان روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آ چکے تھے۔اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ تیمور کو باہر امریکہ پڑھنے کے لیے بھیج دیں۔اس فیصلے سے شاہدہ بیگ بہت خوش تھی۔

''کیا ہوا؟ تجھے پھر غصہ چڑھ گیا۔'' وسیم تیمور کے کمرے میں صوفے پر لیٹ کر سگریٹ پھونک رہا تھا۔''تیرے کمرے کا اے سی فل سپیڈ سے چل رہا ہے۔مجھے تو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ اتنی ٹھنڈ میں تیرا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''گرمی مجھ سے ایک سیکنڈ برداشت نہیں ہوتی۔میرا غصہ یہاں ٹھنڈا نہیں ہوگا۔اب ہم باہر چلتے ہیں۔میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔'' تیمور اپنے جوگرز پہننے لگا۔

''تمہارے پاس سارے برانڈڈ کپڑے اور شوز ہیں۔'' روبی تیمور کی وارڈ روب کے پاس کھڑی اس کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔اس کی وارڈ روب مہنگے سے مہنگے کپڑے، جیکٹس، شوز، پرفیوم، بیلٹس، گاگلز، گھڑیوں سے بھری پڑی تھی۔

''مجھے کوئی بھی لوکل اور سستی چیز پسند نہیں۔میرا نام تیمور شکیل رضا ہے۔جس چیز پر نظر پڑ جائے اور وہ مجھے پسند آ جائے، تو سمجھو وہ میری ہے۔میں ہر چیز کو حاصل کر کے رہتا ہوں۔'' تیمور نے اپنی انگلیوں سے چٹکی بجائی۔دبلا پتلا چودہ سالہ لڑکے نے جینز کے اوپر جانی ڈیپ کی تصویر والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔بال اس کے کندھے تک لمبے تھے۔ایک کان میں سونے کی بالی پہنی ہوئی تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' ڈیزی جو اب تک خاموش بیٹھی تھی۔پیزا کھاتے ہوئے بولی۔

''پہلے سارے چلو پھر بتاتا ہوں۔میرا دماغ پہلے ہی بہت خراب ہو رہا ہے'' تیمور نے

شیلف سے کار کی چابیاں اٹھائیں اور فوراً کمرے سے نکل گیا۔اس کے پیچھے اس کے فرینڈز وسیم، ڈیزی اور روبی بھی باہر آ گئے۔

"صاحب! کباب تیار ہیں۔" سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہی لیلیٰ کچن کے پاس کباب کی ڈش سجائے ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔" تیمور غصے سے بولا۔

لیلیٰ فوراً کچن میں چلی گئی۔روبی کو اس کی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا۔وہ واقعی بہت سر پھرا اور گھمنڈی لڑکا تھا۔چاروں کار میں بیٹھ گئے۔ڈرائیونگ سیٹ پر تیمور بیٹھا اور کار سٹارٹ کی۔

"چھوٹے صاحب! بڑے صاحب نے آپ کو کار چلانے سے منع کیا ہے۔" گھر کا چوکیدار ڈرتے ڈرتے بولا۔اس سے پہلے کہ تیمور کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولتا۔اوپر سے آواز آئی۔چوکیدار کی اوپر نظر پڑی۔وہاں شاہدہ بیگ کھڑی تھی۔شاہدہ بیگ نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کے لیے کہہ دیا۔بے چارے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

تیمور نے زن سے کار باہر نکالی۔کار اب فل سپیڈ میں سڑک پر تقریباً ہوا میں اڑ رہی تھی۔شام کا وقت تھا۔آج پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ تھا۔جس کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک آج کچھ کم تھی۔گاڑی میں اونچی آواز میں گانے لگے ہوئے تھے۔سب اپنی مستی میں دھت تھے۔

تیمور نے اچانک بریک لگا دی۔ایک سائیکل والا بوڑھا شخص سامنے آ گیا۔

"ارے۔اندھا ہے نظر نہیں آتا۔" تیمور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔اس شخص کو سیدھا ایک تھپڑ رسید کر دیا۔اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔"اتنی بڑی گاڑی دکھائی نہیں دیتی۔"

"میں تو ٹھیک جا رہا تھا۔آپ نے ہی غلط ٹرن لیا ہے۔" بوڑھا سائیکل والا ہڑبڑا کر بولا۔

''یار تیمور! چھوڑ اسے کیا کر رہا ہے؟'' وسیم بھی گاڑی سے نکلا اور اس بوڑھے شخص کو تیمور کے چنگل سے آزاد کروایا۔

''تو رک ادھر، ابھی اپنے باپ کو فون کر کے تجھے جیل بھجواتا ہوں۔'' لمبے بالوں والا لڑکا اس شخص کو دھمکی دینے لگا۔ بڑی مشکل سے کسی طرح کر کے وسیم نے تیمور کو دوبارہ گاڑی میں بٹھایا۔

''تیمور! بس کردو کیا ہو گیا ہے؟'' ڈیزی نے بھی اپنے دوست کو شانت کرنے کی کوشش کی۔ روبی بھی پریشان تھی۔ وسیم بھی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

''یار! گاڑی سٹارٹ کر اب چلیں یہاں سے۔''

''جب تک باپ ہے تب تک عیش ہے پھر دیکھ۔'' بوڑھے شخص کے الفاظ تیمور کے کانوں میں پڑے۔ وہ اپنی سائیکل لے کر وہاں سے چلا گیا۔

تیمور نے بھی گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے بھگا دی۔ چاروں اب گاڑی میں خاموش بیٹھے رہے۔ تیمور لگاتار سگریٹ پھونک رہا تھا۔ تھوڑا اور سفر کرنے کے بعد وہ اسلام آباد کے ایک بلند ترین ہوٹل دامن کوہ میں موجود تھے۔

''ہم یہاں ہمیشہ آتے ہیں۔ اب تو میں تنگ آ چکی ہوں۔'' ڈیزی نے اپنی چٹیا کندھے پر کی۔ آج بہت دنوں بعد وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔

''بس سمجھو یہ آخری بار ہے۔'' تیمور نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور ایک گہری سانس لی۔ ''میں بہت جلد امریکہ جا رہا ہوں۔'' وہ بے فکری سے بولا۔

''وہ تو ہمیں پتہ ہے یہ بتا جانی کہ پارٹی کب دے رہا ہے؟'' وسیم کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا۔

''بہت جلد بہت بڑی پارٹی دوں گا۔ اس بار سب ساری زندگی یاد کریں گے۔''

رات ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ تیمور لوہے کی ریلنگ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے پورے شہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

''تم کو یہ جگہ بہت اچھی لگتی ہے ناں۔'' روبی نے تیمور سے سوال کیا۔

''ہاں صحیح کہا۔ مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ مجھے ہر وہ جگہ پسند ہے جہاں سے لوگ اور شہر چھوٹے نظر آئیں۔ مجھے ہوا میں اڑنا، اونچا رہنا پسند ہے۔ ان فیکٹ امریکہ میں، میں جس فلیٹ میں رہوں گا۔ وہاں سے سارا شہر نظر آئے گا۔'' اس کی گفتگو میں غرور اور تکبر صاف نظر آ رہا تھا۔ ''میں نے تو اپنی لائف کی ساری پلاننگ کر کے رکھی ہے۔ تیری طرح نہیں ساری زندگی بچوں کا کاروبار سنبھالنے بیٹھ جاؤ۔'' اس کا صاف اشارہ وسیم کی طرف تھا۔

وسیم کو اس کی اس حرکت سے بہت چڑ تھی۔ دراصل وسیم کے فادر بے بی ڈائپرز کا کاروبار کرتے تھے۔ اور ایک بار انہوں نے کاروبار کے سلسلے میں شکیل رضا سے کچھ رقم قرض کے طور پر لی تھی جو انہوں نے اتار بھی دی تھی۔ تیمور اکثر وسیم کو اس بات پر طنز کرتا تھا۔ آج پھر اس نے وہی بات دہرائی تھی۔ روبی اور ڈیزی کو بھی یہ بات بری لگی تھی۔

اسلام آباد سے نکلنے کے بعد وہ چاروں کافی دیر تک سڑکوں پر یونہی پھرتے رہے۔ ان تینوں کو گھر ڈراپ کرنے کر بعد تیمور اپنے گھر آ گیا۔ گھر کی ساری لائٹس بند تھیں۔ سوائے ہال کے جہاں اس کے والد اور شاہدہ بیگ نائٹ سوٹ پہنے سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔

تیمور اس ہی وقت سمجھ گیا۔ شاہدہ بیگ نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کے لیے کیوں کہا تھا۔ ان کا مقصد اپنے شوہر سے تیمور کو نیچا دکھانا تھا۔

''بیٹھ جاؤ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' شکیل رضا بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔ ان کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ ''تمہارے کمرے سے مجھے یہ ڈرگز کے پیکٹ ملے ہیں۔ کیا تم ڈرگز لیتے ہو؟''

''وہ میرے نہیں ہیں۔ میرے کچھ فرینڈز کے ہیں۔'' ان کا بیٹا صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تمہارے پیپرز نزدیک ہیں۔ تمہیں کچھ فکر بھی ہے۔ اور یہ تمہارے کون سے فرینڈز ہیں جو ڈرگز لیتے ہیں؟ مجھے اب تمہاری لیے ٹینشن ہو رہی ہے۔'' والد کا لہجہ اب نرم ہو گیا۔

''ہیں کچھ فرینڈز آپ نہیں جانتے۔ آپ ہیں تو ٹینشن کس بات۔ اب ہم صبح بات کریں۔'' تیمور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''مجھے ویسے بھی بہت زیادہ نیند آ رہی ہے۔'' اللہ حافظ کہتا اوپر جانے لگا۔

''جب تک میں ہوں ٹینشن نہیں اور اگر میں۔'' اس سے پہلے ان کی بات مکمل ہوتی۔ تیمور تیزی سے زینے چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اے سی پہلے سے فل سپیڈ سے چل رہا تھا۔ واش روم گیا فریش ہوا۔ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جب تک باپ ہے۔'' اس بوڑھے کے الفاظ اور اب اپنے باپ کے ادھورے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ نہ جانے کب نیند آ گئی اور وہ لاپرواہی سے گہری نیند سو گیا۔

☆......☆......☆

''اس کی ماں اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اب اس مصیبت کو مجھے سنبھالا پڑ رہا ہے۔ کیا بتاؤں میری تو زندگی جہنم بن گئی ہے۔'' ماسی کو میز سے برتن اٹھانے کا اشارہ کیا اور خود صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ''سوچا تھا شادی کے بعد آرام سے زندگی گزاروں گی۔ پر یہ مصیبت۔'' کہتے کہتے رک گئی۔

صوفے پر بیٹھی عورت فون پر ناک چڑھا کر اپنی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں فون کا ریسیور اور دوسرے ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ جن کو شاہدہ بیگ بڑے

پیار سے دیکھ رہی تھی۔

''تم اس کو ہوسٹل بھیج دو۔تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''توبہ کرو۔اس کا باپ کبھی نہیں مانے گا۔'' گہری سانس لی۔''ویسے امریکہ بھیجنے کے بارے میں شکیل رضا سوچ رہا ہے۔''

اپنی سہیلی سے ایک گھنٹہ اور بات کی۔فون رکھنے کے بعد کچن کا رخ کیا۔

''آج تمہارے صاحب کے کچھ خاص دوست گھر آئیں گے۔تو ایسا کرنا بریانی، کباب، نہاری بنا دینا۔باقی کھانے کا سامان باہر سے منگوا لیں گے۔'' کچن میں موجود ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالی۔اتنے میں ککر کی سیٹی بولی۔

''آپ فکر نہ کریں۔نہاری کے لیے گوشت ککر میں چڑھا دیا تھا۔اور بریانی کا مسالہ بھی تیار ہو گیا ہے۔'' لیلیٰ فٹ سے بولی۔اپنے ہاتھوں کو تولیے سے خشک کیا۔

شاہدہ بیگ لیلیٰ کے فٹ سے جواب دینے والی حرکت سے بہت تنگ تھی۔

''اللہ کرے تم وقت پر کام ختم کر لو۔یاد ہے پچھلی بار کیا ہوا تھا۔'' لہجے میں شدید طنز تھا۔

''کام ختم کرنے کے بعد کچن اچھے سے صاف کر دینا اور سلاد یاد سے بنا دینا۔اس بار وہ نیا والا ڈنر سیٹ نکال لینا پر احتیاط سے۔کچھ ہوا تو تمہاری تنخواہ سے کاٹوں گی۔'' اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا اور کچن سے نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آ کر اپنی الماری کھولی۔ایک سے بڑھ کر ایک نیا اور مہنگا جوڑا لٹکا ہوا تھا۔ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر الماری پر نظر ڈالی۔سبز رنگ کی ساڑھی نکالی۔اسے اپنے ساتھ لگایا اور شیشے میں خود کو دیکھا۔

''آج یہی ساڑھی پہن لیتی ہوں۔اور اس کے ساتھ ڈائمنڈ سیٹ ٹھیک لگے گا جو مجھے بھائی

نے گفٹ کیا تھا۔" اپنے منہ میں بڑبڑائی۔ "ایک تو میری اس گھر میں ذرا عزت نہیں، یہاں تک کے اس کام والی لیلیٰ کی بچی پر۔ اتنی بار ان سے کہا ہے اس کو کام سے نکال دیں پر مجال ہے جو میری کوئی سن لے۔" ساڑھی کو بیڈ پر پھینکا اور اپنا پیر پٹختی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

☆......☆......☆

"ابو! آج بازار سے آتے ہوئے میرے لیے برفی لے آنا۔" بڑی بڑی گول آنکھوں والی لڑکی نے اپنے والد کو پانی کا گلاس دیا۔ وہ برآمدے میں موجود تخت پوش پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"فرمائشیں شروع ہوگئیں۔" پاس کرسی پر بیٹھے شخص نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"اور جو تم آئے روز سموسے کھاتے رہتے ہو اس کا کیا۔" ستارہ اپنی بھنویں سکیڑ کر بولی۔

"اچھا اب تم دونوں شروع مت ہو جانا۔" آنٹی خدیجہ جائے نماز سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ "لڑے بغیر تم دونوں بہن بھائی ایک دن نہیں رہ سکتے۔"

"تم دونوں بعد میں لڑ لینا ابھی مجھے دکان پر جانے کے لیے دیر ہو رہی ہے۔" حاجی اکرام نے پانی کا خالی گلاس اپنی بیٹی کو دیا۔ "میں بازار سے آتے ہوئے تمہارے لیے برفی لے آؤں گا۔" لہجے میں بہت پیار اور شفقت تھی۔

"ابو! آپ نے اسے بہت سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" اپنی بہن کی چٹیا کھینچی۔

"حسن، کیوں تنگ کر رہا ہے اپنی بہن کو۔ اس کی ہمیشہ ایک ہی فرمائش ہوتی ہے۔"

"برفی۔ برفی۔ برفی۔" اپنی ماں کی بات کاٹ کر حسن اونچی آواز میں بولا۔ "لے آئیں گے برفی، ورنہ پورا ہفتہ منہ پھلا کر پھرے گی۔" حسن اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

"ابو! ایک بات کہنی تھی۔" ستارہ بھی تخت پوش پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ "مجھے بیا لو جی

سبجیکٹ کے لیے ٹیوشن پڑھنی ہے۔ مجھے ٹیچر کی سمجھ نہیں آتی ہے۔ بورڈ کے پیپرز بھی نزدیک ہیں۔“

”تو باقی لڑکیوں کو کیسے سمجھ آتی ہے۔ کیا وہ سب بھی ٹیوشن پڑھتی ہیں۔ اس لیے کہا تھا کہ کمپیوٹر سبجیکٹ رکھ لو مگر نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اپنی مرضی کرنی ہے۔“ سلیم کچن سے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے ہم گھر آ کر بات کرتے ہیں۔ اگر تمہیں ٹیوشن کی ضرورت ہے تو ٹھیک ہے۔ اب ہم دکان کے لیے نکلتے ہیں۔ راستے سے دکان کے لیے کچھ سامان بھی خریدنا ہے۔ مہینے کا آخر چل رہا ہے۔ دکان پر کافی کام ہے۔“ یہ کہتے ہوئے حاجی اکرام نے اپنا رومال اپنے کندھے پر رکھا، اپنے جوتے پہنے اور سب کو اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل پڑے۔

”تم ہمیشہ کی طرح لیٹ ہو۔ کبھی ٹائم پر تیار مت ہونا۔“ ستارہ نے تخت پوش سے ناشتے کے برتن اٹھائے۔ وہ بہت خوش تھی۔

”تم کو زیادہ ضرورت نہیں ہے میری استانی بننے کی؟“ حسن نے جلدی سے چائے کا آخری سپ لیا۔ خالی کپ میز پر رکھا۔ اپنا بیگ لیا اور اپنے والد صاحب کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

صبح کا وقت تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ابھی شروع ہوئی تھیں۔ حاجی اکرام کا چھوٹا سا گھر تھا۔ ان کی اپنی برتنوں کی دکان تھی۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

سب سے بڑا بیٹا اسد اکرام تھا جو میڈیکل کا سٹوڈنٹ تھا۔ وہ لندن میں میڈکل پڑھ رہا تھا۔ وہ کافی سنجیدہ انسان تھا۔ دوسرا بیٹا سلیم تھا۔ اور اپنے آپ کو شہزادہ سلیم سمجھتا تھا۔ حال ہی میں اس کی پسند سے اس کی منگنی کر دی تھی۔ اور سب سے چھوٹا حسن اکرام تھا۔ اس نے ابھی بارہویں کے پیپرز دیئے تھے۔ اس کا خواب کرکٹر بننا تھا۔ ان میں سب سے چھوٹی ستارہ تھی۔

”امی! میں اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ دوپہر تک واپس آ جاؤں گی۔“ ستارہ نے

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی چوٹی باندھی۔ آج کافی دنوں بعد ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔ پنک رنگ کی قمیص جس پر چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ سفید رنگ کی شلوار زیب تن کی ہوئی تھی۔ قمیض کے بارڈر پر کچے دھاگے کی سادہ سی کڑھائی کی ہوئی تھی۔ ستارہ نے یہ کڑھائی خود کی تھی۔

ستارہ نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج رہے تھے۔ اپنے سر پر دوپٹہ لیا۔

''کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں۔ عینی پھر ناراض نہ ہو جائے؟'' اپنی کتابیں بیڈ سے اٹھا کر بیگ میں ڈالیں۔

بیڈ کی چادر ٹھیک کی، بیگ کندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل گئی۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ آنٹی خدیجہ کچن میں کھڑی سبز دھنیا صاف کر رہی تھیں۔ چولہے پر سالن پکنے رکھا تھا۔ وہ کچن کے دروازے پر رکی۔

''آج پھر سلیم بھائی کی پسند کا کھانا پک رہا ہے۔ وہی چکن کڑھائی۔'' ستارہ منہ بنا کر بولی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' ایک رعب دار آواز آئی۔ ستارہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سلیم بھائی دونوں ہاتھ باندھے اس کو گھور رہے تھے۔

''عینی کے گھر جا رہی ہے۔'' آنٹی خدیجہ ہاتھ صاف کرتی کچن سے باہر آئیں۔ وہ سلیم کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ بنا بات کے بات کو بتنگڑ بنا لیتا تھا۔

''ابھی کل تو گئی تھی پڑھنے کے لیے۔ آج پھر جانا ہے۔ واقعی پڑھنے جا رہی ہو یا سب سہیلیوں نے مل کر کوئی ایسی ویسی فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔''

''سلیم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ اور تمہاری یہ ایسی ویسی فلم سے کیا مراد ہے'' اپنے ایک ہاتھ منہ پر رکھ کر حیرت سے بولیں۔

''امی! میں اس سے پوچھ رہا ہوں۔کل اپنی دوست سے گانوں کی کیسٹ لائی تھی۔'' سلیم ڈھٹائی سے بولا۔''ساری رات گانے سنتی ہو اور اب تمہیں پڑھنے جانا ہے۔''

''آپ کو کیا میں جو مرضی کروں۔'' ستارہ جو اَب تک خاموش کھڑی تھی، ہمت کر کے اتنا ہی بولی۔''میں ابو سے اجازت لے کر جا رہی ہوں۔'' اس سے اپنے بھائی سے ویسے ہی بہت ڈر لگتا تھا۔

''زبان سنی ہے اس کی۔کل کو کوئی گل کھلایا تو مجھے مت کہنا۔'' اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''جب سے اس کی منگنی ہوئی ہے بہت بدل گیا ہے۔'' آنٹی خدیجہ افسوس کرتی دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔گھر میں کوئی بھی اس منگنی سے خوش نہیں تھا۔

''امی! آپ نے ہی اسے سر چڑھا کر رکھا ہے۔خود ہر وقت آوارہ گردی کرتا ہے اور رعب ہم پر ڈالتا ہے۔'' وہ جل کر بولی۔

اس سے پہلے آنٹی خدیجہ اس کو کچھ کہتیں ستارہ پیر پٹختی گھر سے نکل گئی۔گلی میں سے گزرتے ہوئے اپنے دوپٹہ سے اپنی لپ اسٹک صاف کی۔اس کا موڈ سخت آف تھا۔

اپنی سہیلی کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔عینی چھوٹے سے دو کمروں کے کرایے کے گھر میں امی اور بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔عینی کی امی نے دروازہ کھولا۔ان کو سلام کر کے عینی کے کمرے میں چلی گئی۔دوسرے کمرے میں عینی کی آپی محلے کے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔ستارہ نے بیگ زمین پر رکھا اور جوتوں سمیت قالین پر بیٹھ گئی۔

''آج پھر بھائی نے کچھ کہا۔اور تم نے فوراً اپنا موڈ آف کر لیا۔'' عینی بھی کتابیں لے کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔وہ اس کی شکل دیکھ کر سمجھ گئی۔

"اس کی تو اب عادت بن گئی ہے۔ مجھے ہمیشہ اب شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بھابھی نے اسے پورا قابو میں کر لیا ہے۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ پہلے صرف غصہ زیادہ کرتا تھا پر اب۔" کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ اپنے بیگ سے رجسٹر نکالا اور سکول کا کام کرنے لگی۔

"عینی! ایک بات پوچھوں؟ میں پہلے پوچھنا بھول گئی تھی۔ اس دن فزکس کے سر نے تمہیں کیوں بلایا تھا۔" ستارہ اپنے منہ میں پین دبا کر بولی۔

"کچھ نہیں ایسے ہی۔"

عینی نے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ اپنا کام کرنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آنٹی ہاجرہ ان کے لیے چائے بنا کر لائیں۔

"تم دونوں کا موڈ کیوں آف ہے۔ آؤ تم دونوں کو جیم بنانا سکھاؤں۔" آنٹی ہاجرہ کبھی محلے کی عورتوں کو اپنے گھر پر جیم بنا کر بیچتی تھیں۔

"ہاں مجھے آپ کے ہاتھ کا جیم بہت پسند ہے۔" ستارہ نے فٹ سے رجسٹر بند کر دیا۔

"پر مجھے تو بنانا آتا ہے۔ امی آپ اسے سکھا دیں۔" عینی اپنے کام میں مگن رہی۔

ستارہ آنٹی ہاجرہ کے ساتھ کچن میں آئی۔ جیم بنانے کا سامان پہلے سے تیار تھا۔

"آج ہم ایپل جیم بنائیں گے۔ سب سے پہلے سیبوں کو اچھے سے دھو لو۔ اور پھر ان کا چھلکا اتار کر اندر سے بیج نکال لو۔"

ستارہ بڑے غور سے آنٹی ہاجرہ کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"چھیلنے کے بعد ان سیبوں کے چھری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لو۔ اب ان سیبوں کے ٹکڑوں کو برتن میں ڈال کر ہلکی آنچ پر چولہے پر چڑھا دو۔ اس میں اب ایک گلاس پانی ڈال کر تقریباً پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دو۔ ستارہ اس بات کا خیال رکھنا کہ اس میں تھوڑی

دیر بعد چمچ ہلاتے رہنا۔ یہ نیچے نہ لگے۔"

آنٹی کے کام کرنے کا انداز واقعی بہت اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ زبان سے زیادہ ان کے ہاتھ تیز چل رہے تھے۔ ستارہ پندرہ منٹ تک وہیں کھڑے ہو کر اپنی چائے پیتی رہی۔ آنٹی ہاجرہ نے چولہا بند کر دیا۔

"پندرہ منٹ بعد اب دیکھو ستارہ، سیب گل گئے ہیں۔" آنٹی ہاجرہ نے چمچ پھیرا۔ سیب گل چکے تھے۔ "اب انہیں ٹھنڈا کر کے گرینڈر میں گرینڈ کر لیں گے۔ اور ان کا پیسٹ بنائیں گے۔"

سیبوں کو ٹھنڈا کرنے کے بعد انہیں گرینڈر مشین میں ڈال کر گرینڈ کر لیا۔

"اب اس پیسٹ کو ایک پین میں ڈال کر دوبارہ چولہے پر چڑھا لیں گے۔ اب اس میں پسی ہوئی چینی آہستہ آہستہ ڈال کر ساتھ میں مکس کرتے جائیں گے۔"

ستارہ ایک ایک چیز کو بڑے غور سے نوٹ کر رہی تھی۔ آنٹی ہاجرہ نے پہلے سے سارا سامان پاس رکھا تھا۔ اس لیے کام کرنے میں بہت آسانی ہو رہی تھی۔

"بس اب خیال رکھنا ہے۔ اس میں ڈھیلے نہ بنیں۔ اس کو دو منٹ پکاؤ اور ایک چٹکی ٹاٹری ڈال دو۔ اب اسے لگاتار مکس کرو۔ جب جیم پین کا ساتھ چھوڑ دے تو جیم تیار ہو جائے گا۔"

ستارہ نے ایک چمچ گرم جیم چکھا۔ جیم واقعی بہت مزے کا تھا۔ اس نے سب کچھ اپنی کتاب میں نوٹ کر لیا۔ جو شاید آگے جا کر اس کے کام آنے والا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے اپنی الماری سے سارے کپڑے نکال کر بیڈ پھینکے۔ ان پر نگاہ دوڑائی۔ اپنی پسند کی ایک کالے رنگ کی شرٹ اٹھائی۔ اس کو اچھالا اپنا تولیہ لیا اور واش روم میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہوا۔ تولیے سے اپنے بال خشک کیے۔ گیلا تولیہ بیڈ پر پھینک دیا۔ میوزک سسٹم اونچی آواز میں آن کر دیا۔ بالوں کو جیل لگایا اور ان کو سلیقے سے سیٹ کیا۔ الماری سے اپنا پسندیدہ پرفیوم نکال کر لگایا۔ گھڑی پر نظر ڈالی رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

بیڈ کے گدے کو اٹھایا وہاں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا۔ لائٹر سے اسے جلایا۔ اپنی بالکونی کے پاس آ کر مین صوفہ پر بیٹھا اور سگریٹ پینے لگا۔ باہر تقریباً اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس کے گھر کے لان کی لائٹ جل رہی تھیں۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کالے آسمان کو گھور رہا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں سگریٹ تھا۔ جس کا دھواں اس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ پھٹی ہوئی جینز کے ساتھ کالے رنگ کی شرٹ زیب تن تھی، جس پر ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ پیروں میں سفید رنگ کے جوگرز تھے۔ گلے میں ایک موٹی سونے کی چین تھی۔ جو اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔

دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ ایک چالیس سال کی عمر کا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ڈش تھی۔ تیمور نے مڑے بنا ریموٹ سے میوزک سسٹم بند کر دیا۔

"تیمور۔ تم پھر سے سگریٹ پینے لگے ہو۔" لہجے میں ناراضگی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جا رہا ہوں۔" سگریٹ دوبارہ ہونٹوں سے لگایا۔

"کھانا کھا لو پھر جہاں جانا ہے چلے جانا۔" کھانے کی ڈش کمرے کے درمیان میں موجود شیشے کی میز پر رکھ دی۔ "پورے ہفتے بعد گھر آئے ہو۔ صاحب تمہارے بارے میں کئی بار پوچھ چکے ہیں۔" بیڈ سے اس کے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگے۔

''ان کے پاس اتنی فرصت تھی کہ میں ان کو یاد آ گیا۔'' سگریٹ فرش پر پھینکا اور اپنے جوگرز سے اسے دبا دیا۔''ابھی جا رہا ہوں، میرے دوست میرا انتظار کر رہے ہیں۔دوبارہ پوچھیں تو کہنا ابھی زندہ ہوں۔ان کے لیے اتنا جاننا کافی ہے۔'' اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''دوست انتظار کر رہے ہیں۔ہوں۔۔اور جو گھر پر انتظار کر رہے ہیں؟'' انداز سوالیہ تھا۔کپڑے الماری میں رکھنے کے بعد اسے بند کیا۔

وہ بنا کوئی جواب دیے وہاں سے چلا گیا۔وہ ایسا پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔اس چالیس سالہ شخص کا نام رحمت خان تھا۔اس نے افسوس نگاہوں سے بند دروازے کو دیکھا۔گاڑی سٹارٹ ہوئی، کار کے ہارن کی آواز پورے محلے نے سنی۔تیمور کی عمر چودہ سال تھی۔اور وہ بنا ڈرائیونگ لائسنس کے گاڑی چلانے لگ گیا تھا۔جس کی وجہ سے اس کے والد صاحب نے چوکیدار کو سختی سے منع کیا تھا۔تیمور جب کار کو گھر سے باہر لے جانے لگے تو وہ گیٹ نہ کھولے۔ تیمور بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔آدھی رات کو کار میں بیٹھ کر لگاتار ہارن بجانے لگتا۔شروع میں چوکیدار گیٹ نہیں کھولتا تھا۔لیکن محلے داروں کی شکایتوں کی وجہ سے اسے مجبوراً گیٹ کھولنا پڑتا۔رحمت خان نے کمرے کی بکھری چیزوں کو سمیٹا۔ان کے علاوہ اس کے غصے کی وجہ سے کوئی اس کے کمرے میں قدم نہیں رکھتا تھا۔کام ختم کرنے کے بعد کھانے کی ڈش اٹھائی، لائٹ آف کی اور کمرے سے باہر آ گئے۔

''یار! ایک ہفتے کے ہم بعد مل رہے ہیں اور تمہارا موڈ آف ہے جانی۔کیا پھر اس محترمہ سے ملاقات ہوئی۔'' وسیم کے ایک ہاتھ میں سگار تھا اور دوسرے ہاتھ میں شیشہ۔اس نے شیشہ منہ میں رکھا اور چند لمحوں کے وقفے کے بعد منہ کھولا۔ان کے چاروں اور دھواں پھیل گیا۔

”ہاں سکول کے ٹرپ سے آج صبح ہی لوٹا ہوں۔اور وہ محترمہ جیسے میری ہی راہ تاک رہی ہو۔کچھ تو اس کے دماغ میں پک رہا تھا۔“ کالی شرٹ والے نے دوبارہ سگریٹ کا کش لگایا۔ جلتی ہوئی سگریٹ کو دونوں انگلیوں کے درمیان پکڑا۔اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس جلتی ہوئی سگریٹ کو غور سے دیکھا۔

”اچھا اپنا موڈ آف نہ کر، گولی مار اسے۔میرے ساتھ آ تمہیں کسی سے ملواتا ہوں۔“ وسیم نے اسے آنکھ ماری، سگار نیچے پھینک دیا۔دونوں اس وقت شیشہ کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے۔کیفے میں رنگ برنگی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔عجیب سا سماں تھا۔ہر کوئی نشے میں دھت تھا۔نشے کی تقریباً ہر آسائش وہاں موجود تھی۔

”میرا بس چلے تو واقعی اسے گولی مار دوں۔“ وہ ہلکی آواز میں بولا۔وہ ابھی تک اس جلتی ہوئی سگریٹ کو دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں جلن تھی۔

وسیم نے اس کی بات ان سنی کر دی۔اپنی جگہ پر کھڑا ہوا۔اپنے دوست کی کلائی کو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ زبردستی باہر لے آیا۔

”کہاں لے جا رہا ہے؟“ اس نے بھی سگریٹ ادھر پھینک دیا۔

”تو بس میرے ساتھ چپ چاپ چل۔اپنی کزن کی دوست سے ملوانے لے جا رہا ہوں۔تین دن پہلے ہی امریکہ سے آئی ہے۔وہ بڑی غضب چیز ہے جانی۔“

کیفے کے باہر کار پارکنگ میں دونوں آ کر کھڑے ہوئے۔ایک کار آ کر ان کے پاس رکی۔دو لڑکیاں کار سے اتر کر ان کے پاس آئیں۔ایک تو وسیم کی کزن ثمن تھی۔اس نے ہمیشہ کی طرح جینز کے اوپر بنا آستینوں والا ٹاپ پہنا ہوا تھا۔بال بالکل چھوٹے کروائے ہوئے تھے۔منہ میں چیونگم چبا رہی تھی۔

اس کے ساتھ اس کی فرینڈ تھی۔ وسیم کا دوست اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے بھی جینز کے اوپر لال رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ رنگ سفید تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکارا لگا ہوا تھا۔ اس کے بڑے بڑے گال تھے۔ جب وہ مسکراتی تو بڑی پیاری لگتی۔

وہ دونوں لڑکیاں چلتی ہوئی ان پاس آئیں۔ سب نے ہینڈ شیک کیا۔

''میرا نام کرسٹل ہے۔ ابھی امریکہ سے آئی ہوں۔ میرے فادر کو پاکستان میں کچھ کام تھا۔ اس لیے میں بھی ساتھ آ گئی۔ سوچا اس بہانے پاکستان گھوم لوں گی۔'' اس نے اپنا تعارف خود ہی کروا دیا۔

''اب ہم تینوں مل کر اسے پاکستان کی سیر کروائیں گے۔'' ثمن چیونگم چباتے ہوئے بولی۔

''ڈن۔'' وسیم فوراً بولا۔ ''ابھی پارٹی میری طرف سے۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔'' اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بولا، ساتھ ہی اپنے بغل میں کھڑے ہوئے دوست کو آنکھ ماری۔

''مجھے تھوڑا کام ہے۔ میں کل تم سب کو ملوں گا ابھی میں چلتا ہوں۔'' تیمور نے کندھے اچکائے۔

''یار! میری فرینڈ اتنی دور سے آئی ہے۔ اور تم جانے کی بات کر رہے ہو۔'' ثمن نے ناک چڑھایا۔ ''کیا سوچے گی دیٹس ناٹ فیئر۔''

''لگتا ہے میرا آنا اچھا نہیں لگا۔ تھوڑی دیر رک جاؤ پھر چلے جانا۔'' کرسٹل نے وسیم سے شکوہ کیا۔ اس سے پہلے وسیم کچھ کہتا۔ تیمور نے اپنی جیب سے کار کی چابیاں نکال لیں۔

''میرا نام تیمور شکیل رضا ہاشمی ہے۔ میں کسی کی مرضی کے مطابق نہیں چلتا۔ اگر میرا دل کیا تو ہم پھر ملیں گے۔'' اس نے وسیم سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے چلتا بنا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"

"دشمن تم کو معلوم ہے موڈی بندہ ہے۔اتنے سالوں سے میرا دوست ہے میں اب تک اسے سمجھ نہیں پایا۔آؤ ہم اندر چلتے ہیں۔"وسیم نے بڑے آرام سے اپنا ایک ہاتھ دشمن کے کندھے پر اور دوسرا ہاتھ کرسٹل کے کندھے پر رکھا۔تینوں کیفے کی طرح چل پڑے۔

تیمور اپنی گاڑی کے پاس کھڑا ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔چابی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔اپنی کار سٹارٹ کی اور زن سے اپنی گاڑی بھگا دی۔

رات کا وقت تھا سڑکیں تقریباً خالی تھیں۔وہ بنا مطلب کے گاڑی ادھر ادھر گھماتا رہا۔اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

ایسا اس کے ساتھ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔جب بھی اس کی ایسی کیفیت ہوتی وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ پاتا۔شروع شروع میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔وہ گھر میں چیختا چلاتا تھا اور اپنا غصہ نکالتا تھا۔یہ رحمت خان کی ہی محنت تھی کہ تیمور نے اپنے اوپر کچھ قابو پایا تھا۔

اپنی گاڑی ایک چائے کی دکان کے پاس لا کر کھڑی کی۔گاڑی سے اترا،کار لاک کی اور ایک لکڑی کے بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔رات کے اس پہر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ارد گرد بہت سی دکانیں تھیں۔زیادہ تر دکانیں موتیا اور گلاب کے پھولوں کی تھیں۔ان پھولوں کی خوشبو پورے فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

"صاحب کیا لیں گے؟"ایک چھوٹی عمر کے لڑکے نے آ کر مسکرا کر پوچھا۔

"چائے۔"مختصر جواب دیا۔

وہ لڑکا وہاں سے چلا گیا۔تیمور کا دھیان سامنے کی طرف تھا۔سڑک کے دوسری طرف ایک دربار شریف تھا۔دربار رنگ برنگی لائٹس سے سجا ہوا تھا۔ایک آدمی ڈھول بجا رہا تھا۔

ڈھول بجاتے ہوئے وہ دیوانہ وار گول گول گھوم رہا تھا۔اس کے دونوں ہاتھ تیز رفتاری سے ڈھول پر بج رہے تھے۔ڈھول کی تھاپ پر بہت سارے لوگ دھمال ڈال رہے تھے۔اس کے لمبے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

اس آواز میں عجیب سا جادو تھا۔اس دھن کا اثر چودہ سالہ لڑکے پر بھی ہوا۔وہ بھی اس آواز کی سحر میں گرفتار ہو گیا۔وہ بنا پلک جھپکائے ڈھول کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔سانسیں مدھم ہو گئیں۔اس کو خود پر قابو نہ رہا۔نہ جانے کتنی دیر وہ اس ہی کیفیت میں ساکت بیٹھا رہا۔

کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔وہ بری طرح ڈر گیا۔اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوا۔اس کے پورے کپڑے پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی شاپر میں بالوشاہی لیے کھڑا تھا۔

''بیٹا!لنگر لے لو۔وہ ساری مرادیں پوری کرے گا۔''

''میں یہ سب نہیں کھاتا۔چلے جاؤ یہاں سے۔''اس نے حقارت سے جواب دیا۔سانس اب بھی پھولی ہوئی تھی۔اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔سورج کی کرنیں ہلکی ہلکی پھیل رہی تھیں۔رات والا رش اب نہیں تھا۔اس کی چائے ٹیبل پر تھی۔جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔وہ اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گیا۔پینٹ کی جیب سے رومال نکالا اپنا پسینہ صاف کیا۔

''پتر،سب ٹھیک ہے۔''

سامنے والی میز پر وہی ڈھول والا بیٹھا ہوا تھا۔اس نے چائے کی چسکی لی۔تیمور نے اب پہلی بار اسے قریب سے دیکھا۔اسکا قد بہت لمبا تھا اور جسامت میں بھی بہت صحت مند تھا۔اس نے گندمی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔کندھوں پر سیاہ شال اوڑھی تھی۔لمبے بال جو

کندھوں تک آ رہے تھے بکھرے ہوئے تھے۔دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ اس کی آنکھیں سبز رنگ کی تھیں جن میں ایک عجیب سے چمک تھی۔

کالی شرٹ والے لڑکے کو اس کی آنکھوں سے کوفت ہوئی۔جیسے وہ اس کو اندر تک جھانک رہا ہو۔اس کا دل ودماغ پڑھ رہا ہو۔

''پتر، سب ٹھیک ہے۔کیا کوئی منت مانگنے آئے ہو؟''ڈھول والے نے دوبارہ سوال کیا۔

''نہیں۔''اس کے لہجے میں سختی تھی ساتھ ہی اپنی نظریں چرائیں۔

''اللہ اپنا کرم کرے۔تیرے دل کی ہر جائز خواہشات پوری کرے۔''

''ہوں۔میں اپنی ہر خواہش پوری کرتا ہوں۔جو چاہتا ہوں حاصل کر کے رہتا ہوں۔'' اپنے کندھے اچکائے اور لڑکے کو دوسری چائے لانے کا اشارہ کیا۔میز پر پڑی چائے زمین پر پھینک دی۔

''رزق ضائع نہیں کرتے پتر۔اللہ ناراض ہوتا ہے۔''ڈھول والے نے اپنی چائے کے کپ میں رس ڈالا۔

''اچھا اللہ ناراض ہوگا تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔مجھ پر کونسا عذاب نازل ہو جائے گا کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔مجھے نہ نماز پڑھنی آتی ہے نہ قرآن پھر بھی میں خوش ہوں۔ہوں۔''

''ایسا نہیں کہتے۔''وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔

سورج کی کرنیں مزید پھیل رہی تھیں۔اس چائے کی دکان پر دو تین اور گاہک موجود تھے۔حلیے سے وہ ٹرک ڈرائیور یا بس ڈرائیور لگ رہے تھے۔لڑکا میز پر گرم چائے رکھ کر چلا گیا۔نہ جانے کیوں وہ اس انجان آدمی سے اتنی باتیں کر رہا تھا۔

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ہمیشہ سے عیش کی زندگی جی ہے۔اپنی لائف کی پوری پلاننگ

کی ہے۔ بہت جلد امریکہ جا رہا ہوں۔'' اس نے چائے کی چسکی لی۔ اپنی پینٹ کی جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا۔ سگریٹ جلانے کے بعد، سگریٹ اور لائٹر واپس جیب میں رکھ دیئے۔

''ویسے اللہ مجھ سے ناراض ہو گا مطلب؟'' اپنی بھنویں اچکائیں۔ ''بچپن میں ٹیچر سے سنا تھا کہ غلط کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔ میں تو ہر طرح کا غلط کام کرتا ہوں اور اب تک عیش کر رہا ہوں۔'' منہ سے سگریٹ کا دھواں نکالا۔ آنکھ مار کر مزے سے چائے پی۔

''اچھا۔'' ڈھول والے نے خالی کپ سائیڈ پر رکھ دیا۔ ''ایک بار گاؤں کے مولوی صاحب نے عیسائیت کا مذہب قبول کر لیا۔ پورے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس گاؤں کے اور آس پاس کے موجود گاؤں کے دیگر علماء اور کچھ مذہبی شخصیات مولوی صاحب کے گھر پہنچ گئیں۔ تا کہ وجہ معلوم کر سکیں۔ مولانا نے اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا۔'' ڈھول والے کا لہجہ بہت سادہ تھا۔ وہ آگے بتانے لگا۔

''مولوی صاجب آگے بتانے لگے ایک دن صبح مجھے نماز کے لیے دیر ہو گئی۔ مسجد میں اقامت ہو رہی تھی۔ وضو کرتا تو اور دیر ہو جاتی مقتدی لعن طعن کرتے۔ اس لیے سوچا آج بنا وضو جماعت کروا دوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ دل میں خوف خدا تو بہت آیا۔ اور میں کسی عذاب اور تکلیف کا انتظار کرنے لگا۔ پر اللہ نے مجھے مہلت دے دی۔ میں نے یہ حرکت بہت بار کی پر اللہ کا کوئی عذاب نہیں آیا۔

اب میں دیر تک سوتا اور بے وضو جماعت کرواتا۔ اب یہ میرا معمول بن گیا تھا۔ مجھ پر اللہ کا کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ میری زندگی روٹین کے مطابق چل رہی تھی۔ میری بیوی نے بھی مجھے کچھ نہ کہا۔ اس ہی طرح ایک دن اذان کا وقت ہو گیا۔ اور غسل کی فرضیت کے باوجود میں نے نماز کروا دی۔ مجھ پر اللہ کا کوئی عذاب نازل نہ ہوا۔ اور میرے دل سے خوف خدا جاتا رہا۔

اس طرح میرے ذہن میں ایک دن خیال آیا۔روزانہ صبح اٹھنے سے بہتر ہے۔کیوں نہ میں عیسائیت کا مذہب قبول کرلوں۔اور یوں میں نے عیسائیت کا مذہب اپنا لیا۔

اور پھر بھی اللہ کا کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔اور میں یوں ہی ڈر رہا تھا۔اب تو کتنے دن ہو گئے اور سب ٹھیک چل رہا ہے۔اس کی بات سن سب حیران رہ گئے۔ایک بزرگ بولے اس سے بڑا کیا عذاب ہوگا کہ اللہ رب العالمین نے تم سے تمہارا دین ہی چھین لیا اور تم نے اپنی آخرت برباد کرلی۔"

ڈھول والے نے اپنی بات مکمل کی۔اپنی جیب سے پیسے نکال کر خالی چائے کے کپ کے نیچے رکھ دیے۔اپنا ڈھول اٹھایا اور وہاں سے جانے لگا۔آسمان کی طرف منہ کر کے بولا۔

"اللہ کا عذاب اور اس کی ناراضگی کی مختلف نشانیاں ہیں۔بس اپنے اندر سے خوف خدا ختم نہ کرنا۔باقی وہ ذات بڑی مہربان ہے۔"

وہ ڈھول والا وہاں سے چلا گیا۔تیمور کی نظریں اس پر جمی تھیں۔جب تک وہ آنکھ سے اوجھل نہ ہوا۔وہ وہیں بیٹھا اس کو دیکھتا رہا۔جب وہ اس کی نظروں سے غائب ہوا۔اس نے بھی چائے کے پیسے چائے کے کپ کے نیچے رکھ دیئے۔

صبح ہو چکی تھی۔اپنی جگہ سے اٹھا،سامنے دربار شریف پر نظر ڈالی۔سڑکوں پر ٹریفک کا رش بڑھ رہا تھا۔بہت سارے لوگ منت مانگنے دربار شریف پر جا رہے تھے۔

وہ بھی اندر جانے لگا۔پر نہ جانے کس خیال سے رک گیا۔اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔دل عجیب سی کشمکش کا شکار تھا۔گاڑی کی کھڑکی کھولی اور اونچی آواز میں گانے لگا لیے۔

☆......☆......☆

وہ گندمی رنگ کے پینٹ کوٹ میں کافی ہینڈسم لگ رہا تھا۔کلین شیف تھا۔بالوں کو طریقے سے سیٹ کیا ہوا تھا۔شہادت کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی۔چہرے پر لگا نظر کا چشمہ اس کی پرسنلیٹی میں اضافہ کر رہا تھا۔اپنی گاڑی فارم ہاؤس کے باہر روکی۔

فارم ہاؤس کے چوکیدار نے کار دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ فارم ہاؤس بڑے بڑے درختوں سے گھرا پڑا تھا۔اپنی کار کو ایک برگد کے درخت کے نیچے لا کر کھڑا کیا۔گاڑی سے نیچے اترا، اپنا بریف کیس لیا اور سیدھا فارم ہاؤس میں چلا گیا۔

پورے فارم ہاؤس میں مدھم روشنی چل رہی تھی۔وہ ایک راہداری سے ہوتا ہوا۔ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوا۔وہاں ایک لمبی میز تھی۔جس کے اطراف میں کرسیاں تھیں۔ان کرسیوں پر پہلے سے چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔کوئی آفس معلوم ہوتا تھا۔وہ شخص بھی ان کے پاس ایک کرسی پر آ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔اپنا بریف کیس زمین پر رکھا۔کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔اس کا سیدھا ہاتھ شیشے کی میز پر تھا۔اس کی انگلیاں میز پر مسلسل پیانو کی طرح بج رہی تھیں۔

”سر! پیپرز تیار ہیں۔“

”ہاں تیار ہیں۔بس اس بار ڈیل میں کچھ فرق ہوگا۔“

”میں سمجھ سکتا ہوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے۔“

”مجھے بہت خوشی ہوئی جان کر۔“ گندمی کوٹ والا مسکرایا۔

”آپ اپنی آفر رکھیں۔“

”دیکھو۔شیخ صاحب ان سب آدمیوں کی طرف سے آپ بول رہے ہیں۔یعنی میں یہ سمجھوں ان سب کی زبان اور آپ کی زبان ایک ہے۔اگر ایسا ہے تبھی میں اپنی آفر رکھوں گا۔“

ہال میں اس وقت خاموشی تھی۔ دروازہ کھلا اور دو ویٹر اندر داخل ہوئے۔ ایک ٹرالی اندر لے کر آیا۔ ٹرالی بے شمار لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ ویٹر نے لوازمات والی ڈشز میز پر سجا دیں۔ دوسرے ویٹر نے سب کو کافی آفر کی۔ وہ دونوں اپنا کام کر کے چلے گئے۔

''تو میں کہہ رہا تھا۔'' گندمی کوٹ والے نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ ہال کے تمام افراد اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''میری طرف سے کام سو فیصد پکا ہوگا۔ یاد رہے مجھے میری آفر ایک ساتھ چاہیے۔ حصوں میں نہیں۔ آپ لوگ پہلے ہی آپس میں ڈسکس کر لیں۔'' اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی آفر بتائیں۔'' شیخ صاحب نے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہر ایک پیپر کا پچیس لاکھ۔'' شکیل رضا ہاشمی نے اپنے کافی کے کپ میں چینی مکس کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔

''کیا۔ شیخ صاحب آپ نے کہا تھا دس لاکھ۔'' ان میں سے ایک آدمی جو کوئی بزنس مین لگ رہا تھا چونکا۔

''ایک منٹ۔ مراد علی۔'' شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ سے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ''ہاشمی صاحب اس بار آپ زیادتی نہیں کر رہے۔''

''نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلایا۔ ''میں نے کچھ زیادہ ڈیمانڈ نہیں کی۔ آپ سب اچھے سے جانتے ہیں۔ یہ کام کتنا رسکی ہے۔ یونیورسٹی میں پہلے سے زیادہ سختی ہو رہی ہے۔ اگر یونیورسٹی والوں کو معلوم ہو گیا تو میرے کیرئیر کے ساتھ میں بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤں گا۔'' شکیل رضا نے کافی کا خالی کپ میز پر رکھا۔

''بچوں کے پیپرز اگلے مہینے ہیں۔ ہم سب آپ کو تین دن کے اندر رقم کا بندوبست کر

دیں گے۔"

"پوری رقم کا بندوبست۔" شکیل رضا ہاشمی نے اپنی ہیرے والی انگلی سے شیخ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

"پوری رقم کا۔" شیخ صاحب اپنی بھنویں سکیڑ کر بولے۔ "یہ ایک لسٹ ہے۔" اپنی قمیض کی جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ "اس میں ان سب سبجیکٹ کی لسٹ ہے۔ جن کے پیپرز ہمارے بچوں کو چاہئیں۔"

شکیل رضا ہاشمی نے کاغذ ان سے لے لیا۔ ایک نظر اس پر ڈالی اور وہ کاغذ اپنی کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔

"آپ سب بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔ پیپرز سے ایک ہفتہ پہلے آپ کو پیپرز مل جائیں گے۔"

شکیل رضا ہاشمی نے اپنا بریف کیس زمین سے اٹھایا۔ اسے میز پر رکھ کر کھولا۔ ان میں سے کچھ ڈاکومنٹ نکالے۔ اپنی جیب سے رومال نکالا۔ اپنے چہرے سے عینک اتار کر اسے صاف کیا۔ عینک دوبارہ پہنی، رومال اپنی جیب میں رکھ دیا۔ وہ ڈاکومنٹس شیخ صاحب کے آگے رکھ دیے۔

"اگر آپ میں سے کوئی بھی چاہے، تو اسے پڑھ لے۔" ساتھ میں بریف کیس سے پین نکال کر میز پر رکھا۔ "اس پر سائن کر دیں۔ مجھے بعد میں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں چاہیے۔"

شیخ صاحب نے وہ ڈاکومنٹس میز سے اٹھائے۔ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ اپنے ساتھ آئے ساتھیوں کو دیکھا۔ اپنے سر کو خم دیا اور ان ڈاکومنٹس پر سائن کر دیئے۔ وہاں موجود باقی لوگوں نے بھی ان پر دستخط کر دیے۔

شکیل رضا ہاشمی کو واپس وہ کاغذات تھما دیے۔انہوں نے وہ کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھے۔سب کو الوداع کہا، اپنے بریف کیس لیا اور فارم ہاؤس سے باہر آ گئے۔فارم ہاؤس کافی بڑا تھا۔ان کے پالتو کتے ان کی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔اندر آئے ہوئے مہمان پچھلے گیٹ سے اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

پالتو کتے شکیل رضا ہاشمی کو دیکھتے ہی بھونکنے لگے۔ساتھ ہی اپنی دم ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔وہاں کا چوکیدار بھی ان کے پاس آ گیا۔ان کتوں کے گلے میں لگے کالر کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔شکیل رضا ہاشمی اپنے پیروں کے بل زمین پر بیٹھ کر ان کے سر پر اپنے ہاتھوں سے پیار کرنے لگے۔

”لگتا ہے کتوں سے بہت پیار ہے۔“

”مجھے اپنی ہر چیز سے بہت پیار ہے۔“پروفیسر شکیل رضا ہاشمی نے بنا مڑے جواب دیا۔

”اور اپنے کام سے مطلب۔اپنے پروفیشن سے۔“لہجے میں بھرپور طنز تھا۔مراد علی اپنی دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے پیچھے کھڑا تھا۔وہ ان تمام آئے آدمیوں میں سب سے ینگ تھا۔

”ہاں اپنے پروفیشن سے۔اور اس ہی پروفیشن سے میرے ہزاروں سٹوڈنٹس آج فیلڈز میں بہت کامیاب ہیں۔میں ان کو کامیاب بناتا ہوں۔اور وہ کامیاب بنتے ہیں۔“وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔اور مڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

”تم کالے دھندے سے پیسے کماتے ہو۔اور اس ہی کالے دھندے سے سٹوڈنٹس کو کامیاب بناتے ہو۔اچھی خاصی پراپرٹی بھی بنا لی ہے۔“مراد علی بنا پلک جھپکے بولا۔”تم ایک پروفیسر ہو۔ایک استاد ہو۔ایک بہت مذہبی پیشے سے تعلق ہے تمہارا۔پر تم تو گناہ گار بھی ہو۔

اپنے سٹوڈنٹس کے، اپنی یونیورسٹی کے اور اس ملک کے۔"

"اس دنیا میں ہر کوئی کسی نہ کسی کا گناہ گار ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ کوئی اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتا۔ مجھے ایک کانفرنس کے لیے جانا ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" پروفیسر شکیل رضا ہاشمی نے اپنی عینک اتار کر اپنی جیب میں ڈالی۔ "چوکیدار۔ ان کتوں کو کھلا چھوڑ دو۔ مہمان چلے جائیں تو گیٹ بند کر دینا۔"

پروفیسر شکیل رضا اپنی گاڑی میں بیٹھ کو اپنے فارم ہاؤس سے نکل گئے۔ جاتے ہوئے اپنی کار کے سائیڈ مرر سے مراد علی پر نظر ڈالی۔ اپنا موبائل نکالا اور ایک کال ملائی۔ ان کے فارم ہاؤس سے نکل جانے کے بعد مراد علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ فارم ہاؤس کے چوکیدار نے ان کتوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ مراد علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھا۔ گاڑی سے اپنا موبائل لیا اور کال ملائی۔ اندر موبائل لے کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

"پروفیسر شکیل رضا ہاشمی۔ آج اس کا اصل چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ واقعی یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس کو پیپرز بیچتا ہے۔ تبھی تو چند سالوں میں اتنی بڑی پراپرٹی کا مالک بن گیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس مچھلی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔"

اپنی گاڑی کے شیشے نیچے کیے۔ اور اونچی آواز میں نصیبو لال کے گانے لگائے۔ دماغ ایک پلاننگ میں مصروف تھا۔ کسی طرح پروفیسر شکیل رضا ہاشمی کو بلیک میل کر کے اس سے بھاری رقم کی ڈیمانڈ کرنی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کا وقت تھا۔ آسمان پر سورج تو تھا، پر اس کی تپش کو دھند نے زمین پر آنے سے روکا ہوا تھا۔ سڑک تقریباً خالی تھی۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کی سانسیں

پھولی ہوئی تھیں۔ شدید ٹھنڈ ہونے کے باوجود اسے پسینہ آ رہا تھا۔ تین قدم چلتی پھر اپنی کلائی پھر بندھی گھڑی کو دیکھتی۔

"ٹیچر تو آج مجھے کلاس میں گھسنے نہیں دیں گی۔ اللہ کرے ٹیچر آج خود لیٹ ہو جائیں۔"

اپنے منہ میں بڑبڑاتی، پیچھے بھاری بستہ پہنے سکول کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گلی میں مڑی اسے اپنا سکول دکھائی دیا۔ سکول کے گیٹ پر ایک وین رکی۔ کچھ بچے وین سے اتر کر سکول میں جا رہے تھے۔ اس کی جان میں جان آئی۔ وہ اور تیزی سے چلنے لگی۔

آخر کار اپنے سکول تک دوڑتی ہوئی پہنچی۔ بڑے سے گراؤنڈ سے ہوتے ہوئی اپنی کلاس روم میں آئی۔ شکر تھا ٹیچر ابھی تک کلاس میں نہیں آئی تھیں۔ وہ سب سے پیچھے جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھی۔

"شکر ہے بچ گئی۔" ستارہ کی سانسیں ابھی تک پھولی ہوئی تھیں۔

"آج سکول کی پرنسپل ہمیں لیکچر دیں گی۔"

"کس چیز کا لیکچر؟"

"بورڈ کے پیپرز کا لیکچر۔ محنت کرو۔ ہمارے سکول کا ایک نام ہے۔ تمہارے والدین کتنی محنت کرتے ہیں۔ بورڈ کے رزلٹ کی بیس پر تمہیں آگے ایڈمیشن ملے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔" عینی رک رک کر بولی۔

پہلے پیریڈ میں میتھ اور فزکس کی ٹیچر کے ساتھ پرنسپل صاحبہ بھی آئیں۔ اور جس طرح عینی نے کہا تھا ویسے ہی انہوں نے ایک لمبا لیکچر دیا۔ پوری کلاس خاموشی سے ان کا لیکچر سنتی رہی۔ عینی مسلسل اپنے ڈیسک پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ ایک دو بار نظر اٹھی تو فزکس کے سر جیسے اسے ہی دیکھ رہے ہوں۔ پرنسپل اور فزکس کے سر کے جانے کے بعد عینی کو جیسے سکون ملا۔

"آج میتھ کی بک کا آخری چیپٹر فنش ہو جائے گا۔اس کے بعد صرف ٹیسٹ ہوں گے۔ کسی کے نمبر کم آئے یا فیل ہوا تو یاد رکھنا۔مجھے ہر سٹوڈنٹ کا سو فیصد رزلٹ چاہیے۔"

مس نے میز سے میتھ کی بک لی اور بلیک بورڈ پر سوال حل کروانے لگیں۔ان کی جیسے دوڑ لگی ہو۔ہر صورت آج کورس مکمل کروانا تھا۔ادھر وہ بلیک بورڈ پر سوال حل کرواتیں،اور ادھر وہ مٹا دیتیں۔کسی کے کچھ پلے پڑ رہا ہے یا نہیں۔ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ان کو بس کورس مکمل کروانا تھا۔

ساری کلاس گم صم اور حیران تھی۔مس کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔اپنا کام ختم کیا اور آرام سے کلاس سے چلی گئیں۔کلاس کی مانیٹر فاطمہ نے مس سے سوال پوچھنے کی کوشش کی،پر مس نے اس کو ہنس کر ٹال دیا۔"تم تو ذہین تم تو خود حل کر لو گی۔"

فاطمہ بھی پریشان ہو گئی۔ظاہر ہے کلاس کی ٹاپر تھی اب اسے بورڈ میں بھی ٹاپ کرنا تھا۔ میتھ کے اکثر سوال ابھی تک انہوں نے حل نہیں کروائے تھے۔اور کل سے میتھ کے ٹیسٹ شروع ہونے تھے۔

اردو کی مس فوزیہ نے بھی یہی حرکت کی۔وہ جب کلاس میں آتی تھیں تو باتیں زیادہ کرتی تھیں اور پڑھاتیں کم تھیں۔اب جب بورڈ کے پیپرز قریب آ گئے تو مس فوزیہ نے سارا بوجھ سٹوڈنٹس پر ڈال دیا۔روزانہ ٹیسٹ کی صورت میں ڈھیر سارا ہوم ورک دیتیں۔اور جو سٹوڈنٹس ٹیسٹ میں فیل ہو جاتیں۔تو وہ دیسی طریقہ آزماتیں،ان کو دس دس ڈانڈے مارتیں۔

بریک ٹائم میں دونوں سہیلیاں ایک ساتھ سکول کے گراؤنڈ میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ویسے سردی تو انہیں زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔پہلے اردو کی مس سے مار کھائی تھی۔بعد

میں کیمسٹری کی مس نے ان کی اچھی خاصی بے عزتی کی تھی۔

''ستارہ۔آج شکر ہے ٹائم پر پہنچ گئی۔مجھے تو ڈر لگ رہا تھا۔کہیں تم چھٹی نہ کر لو۔ہمارے بورڈ کے پیپرز قریب ہیں۔اور تمہارے گھر والوں نے ان ہی دنوں سلیم بھائی کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنی تھی۔'' عینی اس کے لیے فکر مند تھی۔

''یہی بات سارے گھر والوں نے سلیم بھائی کو سمجھائی تھی۔پر ان پر ابھی شادی کرنے کا بھوت سوار تھا۔تنگ آ کر ابو نے شادی کے لیے ہاں کہہ دی۔اسد بھائی بھی شادی پر نہیں آئیں گے۔وہ ادھر امریکہ میں ہیں۔مجھے اپنی فکر لگی ہوئی ہے۔میرا بورڈ کے پیپرز میں کیا بنے گا۔اور میرا خواب یونیورسٹی کے ڈین بننے کا۔اس کا کیا بنے گا؟''

''تم یہ بات ہر بار کرتی ہو۔یونیورسٹی کے ڈین بننے کا خواب۔جس طرح کے ہمارے ٹیچرز ہیں۔مجھے لگا تمہیں ٹیچرز سے نفرت ہو جائے گی۔اور تمہارا خواب، خواب ہی رہ جائے گا۔''

''ہرگز نہیں۔بیشک اپنے ٹیچر سے مجھے نفرت ہو۔پر مجھے پہلے ایک اچھا ٹیچر بننا ہے۔پھر ایک پروفیسر اور پھر یونیورسٹی کا ڈین۔ان ٹیچرز کی وجہ سے اب میں اپنا خواب ضرور پورا کروں گی۔اور دنیا کو بتاؤں گی کہ ایک اچھا استاد کیا ہوتا ہے۔پر فی الحال بھائی کی شادی کی وجہ سے بہت ڈسٹربنس ہو رہی ہے۔''

''تمہاری امی بھی شادی پر خوش نہیں لگ رہی تھیں۔'' اس نے مکئی کا دانہ اپنے منہ میں ڈالا۔

''سچ کہہ رہی ہو۔گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا ہے۔ابو بھی سارا دن دکان پر رہتے ہیں۔اور حسن بھی سارا دن گھر سے باہر رہتا ہے۔امی بھی سارا وقت کاموں میں مصروف رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔نہ جانے جب بھابھی آئے گی تو کیا ہو گا۔''

''یہ بتاؤ تم نے پکا سوچ لیا ہے کہ تم صرف یونیورسٹی کی ڈین بنو گی۔'' عینی نے چند مکئی کے دانے ادھر زمین پر چڑیوں کے لیے پھینک دیئے۔

''ہاں۔سوچو کیا وقت ہوگا۔میں گاڑی سے اتروں گی۔میرے بال ڈائی کیے ہوں گے۔اور ایک سٹائل سے سیٹ کیے ہوں گے۔ہاتھ میں ہینڈ بیگ پکڑا ہوگا۔چہرے پر نظر کا چشمہ لگا ہوگا۔میرا ایک رعب ہوگا۔آتا جاتا ہر سٹوڈنٹ مجھے سلام کرے گا۔میں سب کی فیورٹ ٹیچر ہوں گی۔'' ستارہ آسمان کی طرف منہ کر کے بولی۔

''اور میں کہاں ہوں گی؟''

''تم اداس کیوں ہو رہی ہو۔تم بھی میرے ساتھ ہوگی۔'' ستارہ نے اپنا ہاتھ عینی کے ہاتھ پر رکھا۔

''اگر زندہ رہی۔'' وہ ہلکی آواز میں بڑبڑائی۔

''بکواس نہ کرو۔تم بھی میرے ساتھ ہوگی بلکہ شاید تمہاری شادی ہو جائے۔اور تمہارے تین چار بچے بھی ہوں۔'' ستارہ ہنستے ہوئے بولی۔''یہ بتاؤ تم بڑی ہو کر کیا بنو گی؟''

''کچھ نہیں۔مجھے کچھ نہیں بنا۔تم مجھے بتاؤ تمہاری بیالوجی کی ٹیوشن کا کیا بنا۔'' وہ ہر بار بات بدل دیتی۔

''ابو نے مسئلہ حل کر دیا۔اسد بھائی کے ایک دوست ہیں۔انہوں نے ان سے بات کی تھی۔ان کا چھوٹا بھائی پری میڈیکل میں ہے۔حسن کے ساتھ کرکٹ بھی کھیلتا ہے۔وہ ہمارے گھر مجھے بیالوجی پڑھانے آتا ہے۔میری کافی ٹینشن حل ہو گئی ہے۔''

''چلو شکر ہے تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہوا۔اچھا ہوا میں نے کمپیوٹر سائنس کا سبجیکٹ رکھا ہے۔بریک ختم ہونے والی ہے چلو کلاس روم میں چلتے ہیں۔''

نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔بارشوں کی وجہ سے ٹھنڈ میں اضافہ ہو گیا تھا۔گیس نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی مشکلات اور بڑھ گئی تھیں۔عینی کی امی لکڑیوں پر ہانڈی پکا رہی تھیں۔عینی گھر میں داخل ہوئی اپنی امی پر نظر پڑی۔وہ ایک گتے سے آگ کو ہوا دے رہی تھیں تاکہ وہ آگ نہ بجھے۔وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔اپنے سکول بیگ کو زمین پر پھینک دیا۔

"لگتا ہے کافی تھک گئی ہو آتے ہی بیڈ پر لیٹ گئی ہو۔تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" وہ اس کے سرہانے کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"ٹھیک ہوں۔آپی کہاں ہیں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"زینی مولوی صاحب کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے گئی ہے۔تم کپڑے بدلو، میں کھانا لگاتی ہوں۔تب تک زینی بھی آجائے گی۔" وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئیں۔عینی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"امی۔ایک بات کہنی تھی۔" وہ بھی اپنی امی کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے جلدی بولو کہیں آگ نہ بجھ جائے۔"

"کچھ نہیں بعد میں بات کروں گی۔مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

پھر وہ اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔آنٹی ہاجرہ بھی باہر اپنی ہانڈی کے پاس آگئیں۔تب تک زینی آپی بھی آگئی۔کھانے کی خوشبو سونگھ کو ناک چڑھایا۔ویسے تو زینی بہت فرماں بردار بچی تھی۔بس کھانے کے معاملے میں اکثر نخرے کرتی تھی۔آنٹی نے باہر ہی چارپائی پر کھانا لگایا۔تب تک عینی کپڑے بدل کر آ گئی۔تینوں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

"آپ نے پھر آلو گوبھی پکائی ہے۔مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔" چارپائی پر اپنے پیر لٹکا کر بیٹھی۔

"زینی شکر کرو۔ہم بھوکے پیٹ نہیں سوتے۔شکر ہے یہ نئی ٹیوشن ملی ہے۔پر خرچے پہلے

ہی منہ کھولے کھڑے ہیں۔گھر کا کرایہ، بجلی کے بل، تمہاری شادی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جمع کرنا ہے۔'' آنٹی ہاجرہ نے نوالہ اپنے منہ میں ڈالا۔

''امی! آپ ہر بار وہی باتیں کرتی ہیں۔میں وہاں شادی کروں گی جو جہیز نہ مانگے۔مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔میرے لیے ایسا ہی رشتہ آئے گا۔''اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''اچھا موڈ آف مت کرو۔اللہ اپنا کرم کرے گا۔عینی، تمہیں کیا ہوا ہے پچھلے چند ہفتوں سے کچھ پریشان لگ رہی ہو۔'' آنٹی ہاجرہ نے عینی پر نگاہ ڈالی جو سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا سب ٹھیک ہے۔میں نے کھانا کھا لیا ہے۔''وہ چارپائی سے اٹھی، اپنے برتن اٹھائے۔اندر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اس کو کیا ہوا ہے؟''

''امی! ظاہر سے بات ہے اس کے بورڈ کے پیپرز ہیں۔اس لیے پریشان ہے۔میں بھی اندر جا کر ذرا آرام کرلوں۔ٹیوشن کے بچے تھوڑی دیر تک آجائیں گے۔''

آنٹی بھی عینی کی طرف سے بے فکر ہوگئیں۔زینی آپی کا رنگ اپنی ماں کی طرح سفید تھا۔اور عینی کا رنگ اپنے ابو پر چلا گیا تھا۔حالانکہ آنٹی نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بہت پیار دیا تھا۔ان کو پتا تھا ان کی بیٹی کبھی کبھی محسوس کرتی ہے کہ اس کا رنگ سفید نہیں ہے اور وہ موٹی ہے۔شاید سکول میں کوئی بات ہوئی ہو۔اس لیے وہ اپ سیٹ ہو۔اس عمر میں بچے ایسا فیل کرتے ہیں۔اس لیے انہوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا اور گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''تیمور بیٹا! تم ابھی تک سو رہے ہو۔اٹھ جاؤ یہ کمرے کا کیا حال کیا ہوا ہے؟'' رحمت خاں نے تیمور کے کمرے کے پردے پیچھے کیے۔''تمہارے ابو تمہارا پوچھ رہے ہیں۔''

''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' وہ کمبل کے نیچے سے بولا۔

''آج کتنے دنوں بعد میں آیا ہوں۔ اور تم سو رہے ہو۔ اور یہ کیا مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ تم اب ایک پکے سموکر بن گئے ہو۔''

سورج کی روشنی پورے کمرے میں پھیل گئی۔ پورے کمرے میں سگریٹ کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔

''آپ اپنے دکھ میں اضافہ کر لیں۔ میں اب شیشہ بھی پینے لگا ہوں۔ اور پلیز مجھے سگریٹ چھوڑنے کے لیے مت کہنا۔ وہ اب ناممکن ہے۔ میری زندگی کی ضرورت بن گئی ہے۔''

رحمت خان نے اس پر سے کمبل ہٹایا۔ وہ ابھی تک نیند میں تھا۔ اپنی آنکھیں ملتا اٹھ کر بیٹھا۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اپنے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ نکالا۔ اسے لائٹر سے جلایا اور منہ میں رکھ لیا۔

''تم نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ امریکہ چلے جاؤ گے تو وہاں تمہارا دھیان کون رکھے گا۔ اور کیا پتا، وہاں تم ڈارک ایڈیکٹ بن جاؤ۔ اپنی زندگی کو یوں تباہ نہ کرو۔'' وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ''اگر تمہاری امی زندہ ہوتیں تو کیا وہ تمہیں ان سب کی اجازت دیتیں۔ انہیں تمہاری اس حرکت سے کتنی تکلیف ہوتی۔ کیوں اپنی زندگی تباہ کر رہے ہو۔ کبھی سوچا ہے اپنے فیوچر کے بارے۔''

''کسی کی اتنی ہمت نہیں میری زندگی تباہ کرے۔ میرا نام تیمور شکیل رضا ہے۔ میں اپنا فیوچر پلان کر چکا ہوں۔ اور آپ سے کتنی بار کہا ہے صبح کے وقت لیکچر نہ دیا کریں۔'' اپنے منہ سے دھواں چھوڑا۔

"پلان صرف اللہ کا ہوتا ہے۔اور دوسری بات دوپہر کے دو بج رہے ہیں۔آپ کے والد صبح سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی تم نے کتنے عرصے سے ان سے بیٹھ کر بات نہیں کی۔آج میرے کہنے پر ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھالو۔"

"ٹھیک ہے صرف آپ کے کہنے پر۔ورنہ۔"

"ہاں۔ہاں مجھے پتا ہے آپ تیمور شکیل رضا ہو۔جو اپنی مرضی کا مالک ہے۔پر آج میری بات مان لو۔تم جا کر فریش ہو۔میں تب تک تمہارا کمرہ صاف کروا دیتا ہوں۔آج تو بیگم صاحبہ بھی گھر پر نہیں ہیں۔"

"اور ہاں بیٹی کی شادی مبارک ہو۔اور آج آپ عمرے پر جا رہے ہیں۔ویسے جب آپ واپس آئیں گے۔تو تب میں امریکہ میں ہوں گا۔نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔" سگریٹ ایش ٹرے میں رکھا۔

تیمور نہ چاہتے ہوئے بھی واش روم چلا گیا۔صرف رحمت خان تھے جن کی وہ بات مانتا تھا۔رحمت خان نے اس کے کمرے کی صفائی اپنی نگرانی میں کروانے لگے۔لیلیٰ سے کہہ کر دوپہر کا کھانا لگوایا۔شکیل رضا ہاشمی کو بھی بتا دیا۔آج ان کا بیٹا ان کے ساتھ لنچ کرے گا۔

تیمور فریش ہو کر باہر آیا۔ٹراؤزر کے اوپر ویمپائر کی شکل والی شرٹ زیب تن کی۔گلے میں ایک لاکٹ تھا جس پر بچھو بنا ہوا تھا۔سونے کی چین بھی موجود تھی۔لمبے بالوں کو مختلف رنگوں میں ڈائی کروایا ہوا تھا۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے ڈائننگ ٹیبل پر ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ٹیبل پر پہلے ہی سے کھانا لگا ہوا تھا۔اس کے دونوں چھوٹے بھائی موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔لیلیٰ انہیں کھانا سرو کرنے لگی۔

''بھائی آپ امریکہ جا رہے ہیں۔'' موسیٰ رضا نے پوچھا۔

تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکا اپنے موبائل پر مصروف رہا۔ تیمور نے کبھی انہیں اپنا بھائی نہیں سمجھا تھا۔ وہ دونوں جب بھی اس کے پاس آتے، وہ انہیں ڈانٹ کر بھگا دیتا۔ شاہدہ بیگ نے اپنے بچوں کو اس سے بات کرنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ پر وہ دونوں تیمور کو اپنا بڑا بھائی مانتے تھے۔ اور اس سے بہت پیار بھی کرتے تھے۔ پر تیمور ہی ان سے چڑ کھاتا تھا۔ وہ دونوں اس سے سوال پوچھتے رہے پر تیمور مجال ہے جو کسی بات کا جواب دے دے۔

تیمور نے پلیٹ لی اور اپنے لیے چاول ڈالے۔ شکیل رضا ہاشمی بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بالکل تیار تھے شاید کسی میٹنگ پر جانے لگے تھے۔ لیلیٰ بھی ادھر رک گئی۔

''شکر ہے تمہاری شکل دیکھنے کو ملی ہے۔ مگر تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنایا ہوا ہے۔''

''اگر آپ نے یہی بات کرنی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔ آپ کی بیگم صاحبہ نظر نہیں آ رہیں۔'' اپنی بھنویں اٹھائیں۔ چاولوں کے دو تین چمچ اکٹھے منہ میں ٹھونس لیے۔

شکیل رضا اپنا غصہ ضبط کر گئے۔ اپنے دونوں بازو میز پر رکھے۔ اپنا لہجہ دھیما کیا۔

''بیٹا! تم پچھلے سال پیپروں میں فیل ہو گئے تھے۔ اس بار بھی اتنا گندا رزلٹ آیا ہے۔ میرے سارے دوستوں کے بچے اب کالج میں جا رہے ہیں۔ تم ابھی تک سکول میں بیٹھے ہو۔ اب بڑی مشکل سے تمہیں امریکہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے تمہاری بڑی فکر ہے۔''

''آپ میری فکر نہ کریں۔ میں تیمور رضا ایک دن بہت بڑا بزنس مین بنوں گا۔ ہزاروں لوگ میرے نیچے کام کریں گے۔ اس شہر میں میری سب سے اونچی بلڈنگ ہو گی۔ اور میں اس کا مالک ہوں گا۔'' اس کا سارا دھیان اپنے موبائل کی طرف تھا۔ اس کے بال اس کی گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔

”کم از کم امریکہ جانے سے پہلے اپنا حلیہ تو ٹھیک کرو۔میں نے تمہیں بتانا تھا۔تمہارا امریکہ کے کالج میں بڑی مشکل سے ایڈمیشن ہوا ہے۔دس دن میں تمہارا کالج شروع ہونے والا ہے۔تمہاری فلائیٹ کس دن کی بک کرواؤں۔تمہاری تیاری کب تک ہو جائے گی؟“ان کے لہجے میں ایک باپ کا پیار اور شفقت بھری ہوئی تھی۔اگر تیمور موبائل سے نظر اٹھا کر دیکھتا تو جان پاتا اس کے باپ کی آنکھیں اس وقت اپنے بیٹے کے لیے نم تھیں۔

لیلیٰ نے ایک پلیٹ میں کباب اور سلاد ڈال کر شکیل رضا کو سرو کیے۔انہوں نے فوک لیا اور سلاد کھانے لگے۔وہ تیمور کو بھی سرو کرنے لگی۔پر اس نے اتنے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔وہ فوراً پیچھے کو ہٹ گئی۔وہ شکیل رضا ہاشمی کے پاس کھڑی تھی۔ان کے گلاس میں جوس ڈال رہی تھی۔جب لونگ ہیل پہنے شاہدہ بیگ اندر داخل ہوئیں۔

سامنے کا منظر روٹین سے ہٹ کے تھا۔تیمور کی پشت پر شاہدہ بیگ کھڑی تھیں۔وہ ایک پل کے لیے ادھر ہی رک گئیں۔شکیل رضا ہاشمی اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔اور لیلیٰ جیسے اس ہی فیملی کا حصہ ہو۔آج تو اس نے ہائی پونی کی ہوئی تھی۔اور ایک نیا سوٹ بھی زیب تن کیا ہوا تھا۔

”ماما آگئیں۔ماما آگئیں۔“دونوں بچے اپنی ماں کے پاس چلے گئے۔

”ماما ابھی ناں امریکہ جا رہے ہیں۔“عیسیٰ رضا نے اپنی ماں کو بتایا۔لیلیٰ نے جوس کا خالی جگ اٹھایا اور کچن میں گھس گئی۔

”آپ میری سیٹ دو دن کے بعد کی کروا دیں۔میں تب تک اپنی تیاری کر لوں گا۔اب میں مزید یہاں نہیں رکنا چاہتا۔“اپنی کرسی سے اٹھا،موبائل پر وسیم کو کال ملائی۔زینے چڑھ کر اوپر چلا گیا۔

شکیل رضا ہاشمی کرسی پر سر جھکائے بیٹھ گئے۔شاہدہ بیگ نے اپنے دونوں بیٹوں کو کمرے میں بھیج دیا۔اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہوئیں۔اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے،اپنے شوہر کی طرف جھکیں۔"بیٹے کے جانے کا اتنا دکھ ہے تو ساتھ میں چلے جائیں۔"

کرسی پر بیٹھے شخص نے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑی تھیں۔"لیلیٰ!سب نے کھانا کھا لیا ہے۔فوراً آ کر برتن اٹھاؤ۔"حکم جاری کیا۔"ایسا کرو اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔اس بے چارے کو ماں کا پیار مل جائے گا اور تمہیں۔" دھیرے سے اپنے شوہر کے کان میں کہا۔میز سے شیشے کا گلاس اٹھا کر زمین پر پھینکا اور وہاں سے چلتی بنی۔شیشے کے ٹکڑے پورے فرش پر بکھر گئے۔

تیمور اوپر اپنے کمرے میں آیا۔آج وہ بہت خوش تھا۔رحمت خان نے اس کی ضرورت کا سامان پیک کر دیا تھا۔

"آپ کو پتا تھا میں اتنی جلدی جا رہا ہوں۔"اپنے سوٹ کیس سے ایک شرٹ نکالی اور پہنی ہوئی شرٹ سوٹ کیس میں ڈال دی۔

"یہ کر رہے ہو۔ابھی تمہارا سامان پیک تھا۔"وہ خفا ہوئے۔"مجھے شکیل رضا نے صبح ہی بتا دیا تھا۔تبھی تو میں واپس آیا ہوں۔وہ تمہارے لیے کافی فکر مند اور پریشان تھے۔"اس کا سامان دوبارہ ٹھیک سے رکھا۔

تیمور نے ان کی بات پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو جیل لگا کر سیٹ کیا۔جینز کے ساتھ ہلک کی شکل والی شرٹ پہنی۔اپنے اوپر پرفیوم چھڑکا، پیروں میں جوگرز پہنے،اپنا موبائل لیا اور گھر سے نکل پڑا۔آج چوکیدار نے بھی گیٹ کھول دیا۔

شام ہونے کو تھی۔ آسمانوں پر اڑتے پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ آج کی شام تیمور کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ گاڑی ہمیشہ کی طرح فل سپیڈ میں تھی۔ دور سے اشارہ لال ہوتے دکھائی دیا۔

اس نے گاڑی کی سپیڈ مزید بڑھا دی۔ سڑک پر دوسری گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتا ہوا وہ سب سے آگے کو نکل آیا۔ جیسے وہ اشارے کے پاس پہنچا اشارہ لال ہو گیا تھا۔ وہ تیمور تھا اس نے گاڑی کو بریک نہیں لگائی۔ بلکہ اشارہ توڑ کر نکل گیا۔

"وسیم اس ہی کیفے میں ملتے ہیں۔ میں بس پہنچ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے دس منٹ تک ملتے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

تیمور نے فون بند کیا۔ اور پانچ منٹ میں کیفے کے باہر پہنچ گیا۔ اپنی گاڑی پارک کی۔ اپنی گاڑی سے نکلا، سگریٹ جلایا، گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چہرہ آسمان کی طرف تھا۔

"کیسے ہو؟"

وہ آواز پر چونکا اپنے سامنے دیکھا۔ لمبے کھلے شانوں پر بکھرے بال۔ آنکھوں میں کاجل لگائے۔ آسمانی رنگ کی بنا آستین والی ساڑھی میں دبلی پتلی کرسٹل کھڑی قیامت لگ رہی تھی۔ بلاؤز بہت باریک تھا۔ سورج اس کی پشت پر تھا۔ پر اس شام وہ واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔

"تم کب آئی۔" اس نے اپنا سگریٹ زمین پر پھینک دیا۔

"بس تمہارے آتے ہی میں بھی آ گئی۔" کرسٹل نے اپنے چہرے سے بالوں کو پیچھے کیا۔ "کیسی لگ رہی ہوں۔"

"اچھی۔ یہ وسیم کہاں ہے۔" اپنے دونوں ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالے۔

"صرف اچھی؟" اس نے اپنے کندھے اچکائے۔

"سوری میں ذرا لیٹ ہو گیا۔ یہ سب اس ڈیزی کی وجہ سے ہوا ہے۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔"

وسیم اس ہی وقت وہاں پہنچا۔ "تم تو آج بڑی غضب کی لگ رہی ہو۔" جیسے ہی اس کی نگاہ کرسٹل پر پڑی وہ پلک جھپکنا بھول گیا۔

"میری وجہ سے کب دیر ہوئی تھی۔ جھوٹے میں تو پورے ٹائم پر تیار ہو گئی تھی۔ تم نے مجھے لیٹ پک کیا تھا۔" ایک تھپڑ وسیم کی کمر پر رسید کیا۔

"اگر بحث ختم ہو گئی ہو تو اندر چلیں۔" تیمور کیفے کی طرف چل پڑا۔

چاروں دوست کیفے کے اندر موجود تھے۔ ڈیزی اور وسیم شیشہ پی رہے تھے۔ تیمور سگریٹ کے ساتھ کبھی کبھی شیشہ کو منہ لگا لیتا۔ کرسٹل نے جوس آرڈر کیا۔ وہ جوس کے گلاس میں لگی چھوٹی سی چھتری پر اپنی انگلی پھیر رہی تھی۔ اپنے سامنے بیٹھے تیمور کو دیکھ رہی تھی۔

"میں اتنی محنت سے تیار ہوئی۔ اور تم۔ اور تم نے میری ایک بار تعریف کرنا تو دور مجھے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ایک بار جھوٹی تعریف ہی کر دو۔" اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"پہلی بات مجھے فضول کے چونچلے پسند نہیں۔ دوسری بات کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ تیار ہو کر آؤ۔ میں تیمور رضا ہاشمی۔" اپنے لفظوں پر زور دیا۔ "میں کسی کا پابند نہیں۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔" سگریٹ کا دھواں ساڑھی پہنی لڑکی پر چھوڑا۔

"اچھا ناراض نہ ہو۔ میں یوں ہی کہہ رہی تھی۔" کرسٹل کو تیمور کے بات کرنے کا انداز ذرا پسند نہیں آیا۔ اسے اپنی انسلٹ فیل ہوئی۔ غرور تو تیمور میں واقعی بہت تھا۔

"یہ بتا جانی اچانک ہمیں یہاں کیوں بلایا ہے۔ کس بات کی پارٹی دے رہا ہے۔" وسیم نشے میں دھت تھا۔

"میں پرسوں امریکہ جارہا ہوں۔اس لیے پارٹی دی ہے۔ہوسکتا ہے اب کبھی ملاقات نہ ہو۔" اپنے ہاتھ میں پکڑا لائٹر جلایا۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔کیا تم امریکہ جاکر ہم سے بچ میں نہیں رہو گے۔" ڈیزی حیرت سے بولی۔

اس سے پہلے تیمور کوئی جواب دیتا۔اس کے موبائل پر رنگ ہوئی۔وہ لڑکھڑاتا ہوا کیفے سے باہر چلا گیا۔کرسٹل بھی اپنی ساڑھی سنبھالتی اس کے پیچھے باہر آگئی۔تیمور لکڑی کے بینچ پر بیٹھ گیا۔موبائل کان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔جب بات مکمل ہوئی تو فون اپنی جیب میں ڈالا۔کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔اپنی ٹانگیں کھول کر بیٹھا۔کرسٹل بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔اپنا پرس اپنی گود میں رکھا۔

"ہم تو امریکہ میں مل سکتے ہیں۔تم امریکہ جاکر مجھے اپنا ایڈریس سینڈ کرنا۔" اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

"بس سمجھ لینا امریکہ میں جو سب سے اونچی بلڈنگ ہوگی۔وہیں پر میں ملوں گا۔میرا فلیٹ سب سے ٹاپ فلور پر ہوگا۔جب میں وہاں سے نیچے دیکھوں گا۔تو سب میرے نیچے ہوں گے،تیمور رضا ہاشمی کے نیچے۔" اپنی گردن اونچی کی۔"تم دیکھنا میں ہواؤں میں سب سے اونچا اڑوں گا۔"

"اچھا دیکھنے کے لیے ساتھ رہنا ضروری ہے۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"مجھے قید نہیں پسند۔میں تیمور شکیل رضا اپنے اصولوں کے مطابق زندگی جیوں گا۔یہ دوستی،گرل فرینڈ،شادی میری لائف کا حصہ نہیں۔" تیمور نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"کیا تمہارے پاس بائیک ہے؟یا ہمیشہ گاڑی پر سفر کرتے ہو۔" کرسٹل نے گفتگو کا رخ

بدلا۔ ”میں نے موبائل پر تمہاری پکچرز دیکھی تھیں۔ ہر پکچر میں ایک چیز کامن تھی۔ تمہاری ہر شرٹ پر کوئی بت یا تصویر بنی ہوئی تھی۔“ اپنے پرس سے ٹشو نکال کر اپنا منہ صاف کیا۔

”کیا تمہیں لگتا ہے کہ تیمور رضا کے پاس بائیک نہیں ہوگی۔ مجھ سے یہ گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ اس لیے گاڑی پر سفر کرتا ہوں تاکہ اے سی چلا سکوں۔ اور ہاں مجھے شکل والی یا یوں کہہ لو بت والی شرٹ پہننا پسند ہے۔“

”یہ سونے کی چین۔“

”یہ میری ماں کی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔“ تیمور اس کی بات کاٹ کے فوراً بولا۔ اس چین کو چوما۔

”تم امریکہ جا رہے ہو۔ مجھے وسیم نے بتایا تھا۔ تمہارے پلان کے بارے میں۔ اس لیے تمہارے لیے ایک گفٹ لائی ہوں۔“ اپنے پرس سے ایک پیکٹ نکالا۔ تیمور کی گود میں رکھ دیا۔ ”دیکھ کر بتاؤ کیسا ہے۔“

تیمور نے اس پیکٹ کو کھولا۔ اس میں ایک گھڑی اور ایک شرٹ پیک تھی۔ شرٹ پر ٹارزن کی تصویر بنی ہوئی تھی، جو ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ دونوں گفٹ کرسٹل کو واپس کر دیے۔

”کیا ہوا، پسند نہیں آئے؟“ اس لڑکی کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ ”میں نے تمہاری پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ گفٹ خریدے تھے۔“

”اگر تمہیں تیمور رضا ہاشمی کی پسند کا پتا ہوتا۔ تو تمہیں معلوم ہوتا کہ تیمور رضا ہاشمی صرف برانڈڈ چیزیں استعمال کرتا ہے۔ میں لوکل اور سستی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔“ بجلی کی رفتار سے کھڑا ہوا۔ ”اب چلتا ہوں میں زیادہ دیر ایک جگہ نہیں رکتا۔“ اپنی جیب سے سگریٹ اور

لائٹر نکالا۔ سگریٹ جلایا اور لائٹر ادھر ہی پھینک کر چلتا بنا۔

کرسٹل ادھر ہی بیٹھی رہی۔ غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تیمور اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اپنی گاڑی سٹاٹ کی اور زن سے اپنی گاڑی لے اڑا۔ کرسٹل نے اپنی گود میں رکھی چیزیں ادھر زمین پر پٹخ دیں۔

''گھمنڈی۔ سر پھرا۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ اپنی انسلٹ کا بدلہ تم سے لے کر رہوں گی۔'' اپنے پرس سے موبائل نکالا اور ایک کال ملائی۔ اپنے پیروں کے نیچے ان گفٹس کو روندی ہوئی وہ دوبارہ اندر کیفے میں اپنے دوستوں کے پاس چلی گئی۔

تیمور کیفے سے نکل کر ایک قریبی شاپنگ مال میں گیا۔ اپنے لیے کچھ شاپنگ کی۔ شاپنگ مال سے نکلا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ اپنے لیے کافی لی اور اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا۔ کافی کے دو سپ لیے۔ آسمان پر نظر پڑی۔ آج چودھویں کی رات تھی۔ کافی کا کپ سامنے رکھا۔ اپنے دونوں بازو اوپر کر کے انگڑائی لی۔

''چلو۔ جانے سے پہلے اس ہی دربار سے ہو آؤں۔ کافی دنوں سے طبیعت خراب ہے۔ شاید کچھ فرق پڑ جائے۔'' وہ اپنے منہ میں بڑبڑایا۔

اس نے اپنی گاڑی دربار کی طرف بھگا دی۔ راستے میں ایک جگہ ٹریفک کا رش تھا۔ اپنی گاڑی روکی اور لگاتار ہارن دینے لگا۔

''نظر نہیں آتا۔ اشارہ بند ہے۔ کیوں لگاتار ہارن دے رہے ہو۔'' ٹریفک میں پھنسا ایک اور گاڑی میں بیٹھا شخص، تیمور پر چلایا۔

تیمور نے فل آواز میں گانے لگا دیے اور لگاتار ہارن دینے لگا۔ اس نے تیمور کو دو چار گالیاں نکالیں۔ تیمور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھ گیا۔ اپنی گاڑی سے اترا اور اس

گاڑی والے کو ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنی گاڑی سے نکلتا تیمور نے اسے گریبان سے دبوچ لیا۔پاس کھڑے کچھ لوگوں نے اسے روکا۔

تیمور واپس اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا۔تب تک ٹریفک سگنل کھل گیا تھا۔اس نے اپنی گاڑی وہاں سے بھگا دی۔اور سید ھا دربار شریف کے پاس آ کر روکی۔اپنی گاڑی سے اتر کر باہر آیا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔پر یہاں کا منظر ہی اور تھا۔دربار لائٹوں سے سجا ہوا تھا۔گلاب اور موتی کے پھولوں کی خوشبو ہر سو بکھری ہوئی تھی۔اس سڑک پر بہت زیادہ ہوٹل اور ڈھابے تھے۔اس کی نظر اس ہی ڈھول والے پر پڑی۔تیمور کی عجیب سی کیفیت ہوگئی۔اسے محسوس ہوا جیسے اس کا دل علیحدہ سے دھڑک رہا ہے۔اور سانسیں علیحدہ سے چل رہی ہیں۔

اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔وہ اس ہی لکڑی کے سٹول پر بیٹھا۔وہی لڑکا اس کے پاس آیا۔

"صاحب کیا لیں گے۔" وہی مسکراہٹ۔

"چائے۔"

وہ لڑکا چائے لینے چلا گیا۔تیمور نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا۔اس بار بھیڑ پچھلی بار سے زیادہ تھی۔وہی آدمی دیوانوں کی طرح ڈھول بجا رہا تھا۔اس کے ڈھول کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔بنا چپل کے ننگے پیر وہ کچی زمین پر گول گول گھوم رہا تھا۔اس کے اردگرد بہت سے لوگ دھمال ڈال رہے تھے۔اس کی ڈھول کی آواز میں واقعی ہی جادو تھا۔

تیمور بنا پلکیں جھپکائے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔آنکھوں میں عجیب سی چبھن تھی۔وہ لڑکا چائے رکھ کر چلا گیا۔

اپنے ماحول سے بے خبر وہ اس سٹول پر نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ایک آواز پر چونکا۔اس کی سانس دوبارہ چلنے لگی۔وہ ایک بار پھر پورا پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

طبیعت میں بے چینی تھی۔ آس پاس نظر دوڑائی۔ وہی ڈھول والا اس کے سامنے لکڑی کے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر سے وہی منظر۔

"پتر! سب ٹھیک ہے۔" وہی نرم لہجہ۔

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہوں۔" تیمور کی حالت ایسی تھی۔ جیسے سمندر میں غوطہ لگا کر زندہ بچ نکلا ہو۔ اس نے اپنے اعصاب پر قابو پایا۔ بینچ پر سیدھا ہو کر بیٹھا۔ میز پر نظر پڑی چائے کا کپ سامنے موجود تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے چائے کا کپ پینے کے لیے اٹھایا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ چائے کا کپ واپس میز پر رکھا۔ گھبراہٹ میں چائے کا کپ میز پر گر گیا۔ ساری چائے میز پر پھیل گئی۔ اپنی جیب سے رومال نکالا اور اپنا چہرہ صاف کیا۔

ڈھول والا مسکرایا۔ اس کی چائے کا دوبارہ آرڈر دیا۔ اپنی چائے میں رس ڈبو کر کھایا۔ ڈھول والا بالکل مطمئن اور پرسکون بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آج اس نے سفید رنگ کی شلوار قمیص زیبِ تن کی تھی۔ لمبے بال، کندھے پر شال، ہاتھ کی انگلیوں پر انگوٹھیاں بالکل وہی حلیہ۔ وہ لڑکا نہ جانے کیوں اپنی نظریں چرا رہا ہے۔ ایک بار پھر ایک بوڑھا آدمی شاپر میں بالو شاہی مٹھائی لے کر تیمور کے پاس آیا۔

"بیٹا! لنگر کھا لو۔ وہ دلوں کی مراد پوری کرے گا۔"

"میں نہیں کھاتا یہ لنگر۔ اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔" اس نے اپنے کندھے اچکائے۔ "تم جیسے لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے ان فالتو کی چیزوں کی۔ میں تیمور رضا ہاشمی ہوں کسی سے نہیں مانگتا۔"

وہ بوڑھا آدمی وہاں سے چلا گیا۔ وہ بچہ دوبارہ گرم چائے لے آیا۔ تیمور نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر جلایا، ساتھ میں چائے کا سپ لیا۔ دربار شریف پر اب بھی رش تھا۔ لوگ اپنی منتیں مانگنے آ رہے تھے۔

”چائے کیسی ہے؟“

”میں ان دونوں چائے کے پیسے میں خود ادا کر دوں گا۔“ اس نے چائے کا سپ لیا۔

”پچھلی بار آپ نے ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہ مولوی والا۔“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں پتر یاد ہے۔ کیوں کیا ہوا؟“ ڈھول والے کی سبز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ آسمان پر چمکتے چاند کے آگے کبھی بادل آتے تو کبھی غائب ہو جاتے۔

”اللہ تعالیٰ نے اس مولوی سے سزا کے طور پر اس کا مذہب چھین لیا۔ پر اس کو کھانے کے لیے، پینے کے لیے، پہننے کے لیے دیتا رہا۔ رہنے کے لیے گھر دیا۔ یہ سب چیزیں اس سے کیوں نہیں چھینیں؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ پھینک دیا۔

”ہائے پتر۔ وہ بڑا کرم والا ہے۔“ ڈھول والا آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ آپس میں جوڑ کر بولا۔

”پتر! میں تجھے ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار ایک نوجوان نے ایک بزرگ سے ایسا ہی سوال پوچھا۔ بزرگ نے اس نوجوان سے سوال کیا۔

کیا تمہاری نماز میں خشوع، خضوع ہے۔ نوجوان بولا، نہیں۔

کیا پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتے ہو۔ نوجوان بولا، نہیں۔

کیا قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے لذت محسوس کرتے ہو۔ نوجوان بولا، نہیں۔

کیا نیکی کرتے ہوئے دل صاف ہوتا ہے۔ اس نوجوان نے جواب دیا، نہیں۔

کیا ہر وقت ذکر کرتے ہو۔ نوجوان نے جواب دیا، نہیں۔“

ڈھول والا مسکرایا اور بولا۔ ”بزرگ نے کہا بس یہی میرے اللہ کی وہ نعمتیں ہیں۔ جو اپنے نافرمان بندوں سے چھین لیتا ہے۔“

تیمور کا وجود پھر سے کپکپانے لگا۔ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جیب سے چائے کے پیسے نکال کر خالی چائے کے کپ کے نیچے رکھ دیے اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

”پہلے واقعہ میں اللہ نے ایک بندے سے اس کا مذہب چھین لیا۔ اور دوسرے واقعہ میں اللہ نافرمان بندوں سے نعمتیں چھین لیتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ زندگی گزارنے کے لیے انسان کو جو چاہیے۔ وہ اس مل رہا ہوتا ہے۔ اس سے آگے انسان کو کیا چاہیے۔“

”تو سمجھا نہیں پتر پر بہت جلد سمجھ جائے گا۔“ وہ مسکرایا۔ تیمور کی سمجھ میں واقعی کچھ نہ آیا۔ ایک نظر دربار پر ڈالی پھر ڈھول والے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جیب سے گاڑی کی چابی نکالی اور فوراً وہاں سے نکل پڑا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سارا راستہ اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ ذہن ایک بار پھر عجیب کشمکش کا شکار تھا۔

گھر جاتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اپنے کمرے کی لائٹ آن کی۔ اس کے دونوں سوٹ کیس تیار تھے۔ میز پر ایک پیکٹ تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے پیکٹ کو کھولا۔ اس میں اس کی ٹکٹ اور کچھ دوسرے ڈاکومنٹس تھے۔ جوتوں سمیت ادھر صوفے پر لیٹا۔ اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے اسے اپنی گود میں رکھا۔ امریکہ میں اپنی یونیورسٹی کے بارے میں سرچ کرنے لگا۔

اس کی کل رات کی فلائٹ تھی۔ آج وہ سچ میں بہت خوش تھا۔ اپنے تمام دوستوں کو موبائل پر مسیج کر کے بتایا۔ ادھر صوفے پر لیٹے نیند آ گئی۔ وہ وہیں سو گیا۔ ایک پلاننگ انسان کرتا ہے، اور ایک پلاننگ اللہ کی ہوتی ہے۔ وہ پرسکون سو گیا۔ آج دسمبر کے مہینے کی آخری رات تھی۔ کل سے اس کی زندگی ایک سو اسی ڈگری کا ٹرن لینے والی تھی۔

☆......☆......☆

صبح کا وقت تھا۔ وہ فجر کی نماز سے ابھی فارغ ہوئی تھی۔ کل رات طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ آنکھ کھلی اور گھڑی پر نظر پڑی صبح کے چھ بج چکے تھے۔ اپنی چارپائی سے اٹھی منہ ہاتھ دھویا۔ چائے بنانے کے لیے پانی دیگچی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ جیسے پانی میں ابال آیا اندر پتی ڈال دی۔ پتی کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔

اپنا بستر ٹھیک سے لگایا۔ الماری سے دودھ کا ڈبہ نکالا۔ دودھ کو ابلتی پتی میں ڈال دیا۔ کھڑکی کا پردہ پیچھے کیا، باہر جھانکا۔ سورج کی بادشاہت قائم ہو چکی تھی۔ سورج کی کرنیں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔

چائے ابلی تو اسے اپنے کپ میں انڈیلا۔ چائے کا کپ اپنی میز پر رکھا۔ خود چارپائی پر بیٹھ گئی۔ رات کا آدھا نان پڑا ہوا تھا۔ اسے ہی چائے میں ڈبو کر کھایا۔ اپنا ناشتہ ختم کرنے کے بعد اپنی دوا لی۔

نوربی بی پچھلے کئی سالوں سے ایسے ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں تنہا اپنی زندگی جی رہی تھی۔ عمر زیادہ نہ تھی، ینگ تھی۔ پر زندگی نے اس کے ساتھ ایسا کھیل کھیلا۔ اس کے اپنوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا۔ ایک چھوٹی سی نوکری سے اپنی زندگی کا خرچہ اٹھا رہی تھی۔

آج بخار ہونے کے باوجود کام سے چھٹی نہ کی۔ بھورے رنگ کی شلوار کے اوپر کالے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اپنے سر اور جسم کو بڑی سی چادر سے ڈھانپا ہوتا۔ ایک شاپر میں گندم اور چاول کے دانے لیے اور اپنے کام پر نکل پڑی۔ اس کا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ اس کا گھر (کمرہ) یونیورسٹی میں تھا۔ وہ ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں کام والی تھی۔ اس یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس اور گراؤنڈ میں جھاڑو لگانے کا کام کرتی

تھی۔ اپنا جھاڑو ہاتھ میں لیا اور گراؤنڈ میں صفائی کرنے کے لیے پہنچ گئی۔ صبح کا وقت تھا یونیورسٹی کا گراؤنڈ خالی تھا۔ مالی فجر کی نماز کے فوراً بعد گراؤنڈ میں لگی گھاس اور پودوں کو پانی دیتا۔ وہ گراؤنڈ میں پہنچتی تو گھاس سے اٹھتی مٹی کی خوشبو اسے بے حد پیاری لگتی۔

درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوتیں۔ سورج کی تپش ابھی زمین تک نہیں پھیلی تھی۔ درختوں کے آس پاس سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوتے۔ وہ سب سے پہلے اپنے جھاڑو سے انہیں اکٹھا کرتی۔ اکٹھا کرنے کے بعد انہیں نیلے رنگ کی بڑے سے ڈرم میں ڈال دیتی۔

روزانہ اپنے ساتھ چاول اور گندم کے دانے لاتی اور انہیں شاپر سے نکال کر ان درختوں کے نیچے رکھ دیتی۔ درختوں پر بیٹھی چڑیاں دانہ لینے پہنچ جاتیں۔ اپنا جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر وہ سائیڈ پر کھڑے ہو کر ان چڑیوں کو دانہ چگتے دیکھتی۔

جب چڑیاں اپنا دانہ لے اڑتیں پھر وہ سکون سے باقی گراؤنڈ کی صفائی کرتی۔ یہاں کی صفائی کرنے کے بعد وہ ڈیپارٹمنٹس کا رخ کرتی۔ اس کی کئی سالوں سے یہی روٹین تھی۔

نور بی بی اسلامیات کے ڈیپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بعد ادھر ہی تھک کر راہداری میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ جھاڑو اپنے پاس زمین پر رکھ دیا۔ اس ڈیپارٹمنٹ کے سٹوڈنٹ آئے اور اپنی کلاس میں بیٹھ گئے۔ پورے آٹھ بجے اسلامیات کی پروفیسر حلیمہ کلاس میں داخل ہوئیں۔ ان کو دیکھتے ہی پوری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔

آج سٹوڈنٹ کو پریزینٹیشن دینی تھی۔ پروفیسر حلیمہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔ رول نمبر کے حساب سے پہلی سٹوڈنٹ آمنہ سامنے آئی۔ اس نے جینز کی پینٹ کے اوپر گھٹنوں سے اوپر قمیص پہنی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر سکاف تھا۔ نور بی بی کو وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنی پریزینٹیشن سٹارٹ کی۔

”آپ سب کے نزدیک انسان کے پاس کتنے دل ہوتے ہیں۔یقیناً ہر انسان کے پاس ایک ہی دل ہوتا ہے۔پر آج میں آپ سب کو تیرہ قسم کے دل بتاؤں گی۔“

پوری کلاس حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگی۔باہر کرسی پر بیٹھی نور بی بی نے ماتھے پر بل ڈال کر اس لڑکی کو ناگواری سے دیکھا۔

”دل تو ایک ہی ہوتا ہے۔پر یہ قسم سے کیا مراد ہے۔“وہ اپنے منہ سے بڑبڑائی۔

وہ لڑکی چہرے پر مسکراہٹ لیے دوبارہ بولی۔

”یہ قسم کسی انسان نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کی ہے۔پہلی قسم قلب سلیم ہے۔سورۃ الشعراء آیت نمبر۔89

1۔اللہ کی نظر میں پہلا دل قلب سلیم ہے۔یہ وہ دل ہے جو کفر اور گندگی سے پاک ہوتے ہیں۔قلب سلیم دل کے مالک لوگ ذہنی اور جسمانی گندگی بھی نہیں پھیلاتے۔اور یہ خود بھی کفر اور غلط کاموں سے پاک رہتے ہیں۔اور دوسروں کو بھی کفر کے کاموں سے بچا کر رکھتے ہیں۔

دوسری قسم قلب منیب ہے۔سورۃ ق آیت نمبر 33

2۔اللہ کی نظر میں دوسرا دل قلب منیب ہے۔یہ وہ دل ہے جو اللہ سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔اور اس کی اطاعت میں مصروف رہتے ہیں۔یہ لوگ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی اور توبہ کرتے رہتے ہیں۔اللہ ایسے لوگوں کو بہت پسند فرماتا ہے۔“

نور بی بی کا پورا دھیان اس لڑکی کی باتوں کی طرف تھا۔راہداری سے دوسرے سٹوڈنٹس بھی گزر رہے تھے۔جس کی وجہ سے شور ہو رہا تھا۔پر وہ آمنہ کی باتوں میں مگن تھی۔

”تیسری قسم قلب مخبت سورۃ الحج آیت 54

3۔اللہ کی نظر میں یہ وہ دل ہے جو جھکے ہوئے اور پرسکون ہوتے ہیں۔اگر آپ سب بھی

اپنی زندگی میں سکون اور اطمینان چاہتے ہیں تو عاجزی اختیار کریں۔اس بارے میں ایک حدیث شریف بھی ہے۔آنخضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔"جو بھی اللہ کے لیے جھکتا ہے۔یعنی عاجزی اختیار کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو بلند کر دیتا ہے۔"

چھوتی قسم قلب وجل سورۃ المومنون آیت 60

4۔یہ وہ دل ہے جو نیکی کرنے کے بعد بھی یہ سوچتا رہتا ہے کہ معلوم نہیں اللہ ہماری یہ نیکی قبول کرے یا نہ کرے۔یہ لوگ ہر وقت عذابِ الٰہی سے ڈرتے رہتے ہیں۔یہ بنیادی طور پر تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔یہ جانتے ہیں اللہ نے اپنے انبیاء کو بھی غلطی کی سزا دی تھی۔تو ہم تو ایک عام سے انسان ہیں۔اس لیے یہ اپنی بڑی نیکی کو بھی حقیر سمجھتے ہیں۔آنخضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔"جب تیری نیکی تجھے خوش کرے اور تیری برائی تجھے رنجیدہ کرے تو تو مومن ہے۔"

پانچویں قسم قلب تقی سورۃ الحج آیت 32

5۔یہ وہ دل ہے اللہ تعالیٰ کہ شعار کی تنظیم کرتے ہیں۔ہم میں بے شمار ایسے لوگ ہیں۔جو شعار خداوندی پر مکمل عمل نہیں کر پاتے۔یہ ان شعار کی عبادت کی طرح تنظیم کرتے ہیں۔اس دل والے لوگ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے عبادت نہ کر سکیں۔تو یہ روزے داروں کے سامنے کھاتے پیتے نہیں۔اور نماز اور اذان کے وقت خاموشی اختیار کرتے ہیں۔اللہ کو یہ لوگ بات محبوب ہیں۔

چھٹی قسم قلب مہدی سورۃ التغابن آیت 11

6۔اس دل کے لوگ اللہ کے فیصلے اور احکامات پر راضی رہتے ہیں۔ہمارے ارد گرد ایسے لوگ ہیں۔جو اکثر برے اور تکلیف دہ واقعہ کے بعد کہتے ہیں۔جو اللہ کی مرضی، جیسے اللہ کا

فیصلہ۔ایسے لوگ کبھی خسارے کا شکار نہیں ہوتے۔جب لوگ ایسے دل والوں کو تکلیف دیتے ہیں۔تو اللہ ان لوگوں کے لیے آسانیاں اور خیر پیدا کر دیتا ہے۔“

چھٹی قسم کے دل والوں کے بارے میں سننے کے بعد نوربی بی کے پسینے چھوٹ گئے۔اس کی ساری زندگی تکلیفوں سے بھری ہوئی تھی۔اور وہ اکثر اللہ سے ان تکلیفوں کا شکوہ اور شکایت کرتی رہتی تھی۔اور اس ہی وجہ سے اس نے اللہ سے دعا مانگنا چھوڑ دیا تھا۔اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ آمنہ کی مزید باتیں سنے۔پر پھر وہ ادھر بیٹھی رہی۔

ساتویں قسم قلب مطمئن سورۃ الرعد آیت 28

7۔اس دل کے لوگوں کو اللہ کے ذکر اور توحید سے سکون ملتا ہے۔اس دل کے لوگ صرف اللہ پر بھروسہ اور یقین کرتے ہیں۔یہ دن رات اللہ کی تسبیحات کرتے ہیں۔اللہ کی تسبیحات کرنے والے ہمیشہ مطمئن اور خوش رہتے ہیں۔اگر آپ میں سے کسی کو کوئی تکلیف یا پریشانی ہے۔تو اللہ کی تسبیحات کریں۔اور سب سے بہتر تسبیح درود شریف ہے۔درود شریف تمام عبادتوں سے واحد وہ عبادت ہے۔جو ہر حال میں قبول ہو گی۔اور دوسری بہتر تسبیح استغفر اللہ ہے۔“

کلاس روم سے باہر بیٹھی ہوئی عورت جسے پوری یونیورسٹی والے ماسی کہتے تھے۔اپنے دل کو ٹٹول رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا اس کا دل پھٹ جائے گا۔آمنہ کی باتوں میں واقعی جادو تھا۔وہ جیسے جیسے بول رہی تھی۔نوربی بی اس کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو رہی تھی۔

آٹھویں قسم قلب حئی سورۃ ق آیت 37

8۔اس دل کے لوگ اللہ کی نافرمان قوموں کا انجام سن کر ان سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتے ہیں۔جو لوگ کم تولنے، جھوٹ بولنے، شر پھیلانے، شرک، کفر اور تبرک کرنے

والی برائی کی طرف راغب ہونے، بچوں، عورتوں اور جانوروں پر ظلم کرنے والوں کا انجام دیکھ اور سن کر توبہ کر لیتے ہیں۔ اور اپنی زندگیاں ان گناہوں سے پاک کر لیتے ہیں۔ اللہ کی نظر میں وہ لوگ قلب حیّ ہوتے ہیں۔ اللہ پاک ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

نویں قسم قلب مریض سورۃ الاحزاب آیت 32

9۔ یہ وہ دل لوگ ہوتے ہیں۔ جو شک، بداخلاقی، ہوس اور لالچ کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بری حرکتوں کو عادت سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت میں یہ روح اور دماغ کی بیماریاں ہیں۔ اور جو لوگ ان بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اذیت ناک زندگی جیتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو اور ان کے دلوں کو مریض سمجھتا ہے۔ جو لوگ شک کا مرض پال لیتے ہیں۔ وہ زیادہ تر دل، آنکھوں، گردوں، پھیپھڑوں اور جسمانی دردوں کے مریض بن جاتے ہیں۔ اگر آپ شک کا مرض اپنے دل سے نکال دیں تو آپ کی تکلیفیں کم ہو جائیں گی۔

دسواں قسم قلب الاعمی سورۃ الحج آیت 46

10۔ دسویں نمبر پر وہ دل ہے۔ جو نہ دیکھتے نہ سنتے ہیں۔ یہ بے حس لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو اندھے اور بہرے لوگ سمجھتا ہے اور مومنوں کو حکم دیتا ہے کہ تم ان لوگوں کو سلام کرو اور آگے نکل جاؤ۔ یہ بنیادی طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن سے قدرت بھی مایوس ہو جاتی ہے۔ جب بھی یہ لوگ ملیں۔ ان سے فوراً کردہ اور نہ کردہ گناہوں کی معافی مانگیں۔ ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ ان کو بس سلام کریں اور آگے نکل جائیں۔

گیارہ قسم قلب اللاھی سورۃ الانبیاء آیت 3

11۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن سے غافل اور دنیا کی رنگینیوں میں مگن ہیں۔ اللہ بھی ان غافل لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور یہ بالآخر عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔

بارہواں قسم قلب الاثم سورۃ البقرہ آیت 283

12۔یہ وہ دل کے لوگ ہیں جو حق پر پردہ ڈالتے اور گواہی چھپاتے ہیں۔گواہی چھپانے اور حق پر پردہ ڈالنے والے معاشرے اور لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔اللہ کو یہ دل والے لوگ پسند نہیں۔

تیرہواں قسم قلب متکبر سورۃ المومن آیت 35

13۔اس دل والے لوگ تکبر اور کشی میں مبتلا ہوتے ہیں۔یہ اپنی دین داری کو بھی گھمنڈ بنا لیتے ہیں۔یہ ظلم اور جارحیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔تکبر اللہ پاک کی ایک صفت ہے۔معاشرہ ہو،ملک ہو یا پھر لوگ ہوں۔ایسے لوگ فرعون اور نمرود کی طرح عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔دنیا میں کسی مغرور انسان کو آج تک عزت نہیں ملی۔ایسے لوگ ہمیشہ ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔اللہ ان دل والے لوگوں کو ناپسند کرتا ہے۔

تو یہ تھے تیرہ قسم کے دل جو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیے ہیں۔ہم سب کو اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ ہمارا دل کون سا ہے۔اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔اللہ ہم سب کو نیک ہدایت دے۔"

آمنہ نے اپنی پریزینٹیشن ختم کی۔پروفیسر حلیمہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنے سر کو خم دیا۔اس کی فرینڈز نے اسے تھمبز آپ کا اشارہ کیا۔آمنہ اپنی سیٹ پر واپس چلی گئی۔پروفیسر نے اپنے رجسٹر پر نمبر نوٹ کیے۔اب آمنہ کے گروپ کی ایک اور لڑکی کی باری تھی۔وہ اپنی فائل ہاتھ میں لیے کلاس کے سامنے آئی۔

نور بی بی کو پہلے ہی بخار تھا۔اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔اپنے دوپٹہ سے اپنا چہرہ صاف کیا۔وہ تو کبھی کبھی صرف فجر کی نماز پڑھتی تھی۔پچھلے چند سالوں میں کوئی بھی ایسا کام

نہیں کیا۔ جس سے اللہ خوش ہو۔

کلاس ابھی جاری تھی۔ وہ وہاں سے اٹھی، اپنا جھاڑو پکڑا اور باہر گراؤنڈ میں آ گئی۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ بے جان قدم چلی اور ایک درخت کے سائے میں آ کر بیٹھ گئی۔ خوف سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''میں اللہ سے ناراض ہوں۔ ایک دن پہلے، ہفتہ پہلے، دس پہلے، مہینہ پہلے، سال پہلے۔ نہیں بلکہ کئی سالوں سے ناراض ہوں۔ جو میرے ساتھ ہوا کیا وہ میری غلطی تھی۔ یا میری آزمائش تھی۔ کیا اللہ مجھے آزما رہا تھا۔'' درخت کے نیچے تنہا بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ''میں نے تو کتنے سالوں سے عبادت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہائے۔ اللہ کے نزدیک میرا دل کیسا ہوگا۔''

''ماسی! ادھر آ بڑی میڈم بلا رہی ہیں۔'' ایک اور کام والی نے اسے آواز لگائی۔ نور بی بی کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔ پہلے صرف دماغ پر بوجھ تھا۔ اب دل پر بھی بوجھ پڑ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''کیا ساری پلاننگ ہو گئی ہے؟ ایک بار پھر چیک کر لو۔''

''یہ ثاقب بیگ کی پلاننگ ہے۔ میں اپنی پلاننگ ہمیشہ اچھے سے کرتا ہوں۔ میری پرفیکٹ پلاننگ ہے۔'' اس نے کرسی سے اٹھ کر چٹکی بجائی۔

''یار! وہ سب تو ٹھیک ہے۔ پر ایک بار پھر چیک کر لو۔ مجھے تسلی ہو جائے گی۔'' مراد علی دیوار پر نقشہ دیکھ کر بولا۔

''تو بس ڈرنا چھوڑ دے۔ مجھ پر مکمل بھروسہ رکھ۔ کوئی غلطی نہیں ہو گی۔ میں یہ پلاننگ سالوں سے کر رہا ہوں۔''

مراد علی اور ثاقب بیگ دونوں دبئی کے فارم ہاؤس پر موجود تھے۔ میز اور دیوار پر کچھ تصویریں اور نقشے لگے ہوئے تھے۔ دونوں ہفتوں سے کسی پلاننگ پر کام کر رہے تھے۔

”مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے۔ ویسے بھی اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ میں ایک پارٹی سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ ڈیٹ بھی فکس ہو گئی ہے۔ اب سب کچھ تم پر ہے۔“

مراد علی نے اپنے دوست کو دیکھا۔ جو اپنی پینٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑکی سے باہر ریگستان کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے وقت ریگستان بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ کچھ عجیب سی کشش تھی۔

”میں پیچھے ہٹنے والوں سے نہیں ہوں۔ میں کل کی فلائٹ سے چائنہ جا رہا ہوں۔ تو بھی کام پر لگ جاؤ۔ ہم دو ہفتوں بعد اس ہی جگہ ملیں گے۔ جو ہم نے طے کی تھی۔ اور آئندہ سے مجھے میرے نئے نمبر پر کال کرنا۔“

”ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ میں اپنی پارٹی سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ مکمل تیاری سے رہیں۔ ان کو ان کا حصہ مل جائے گا۔“

”میں اب چلتا ہوں۔ اور تم گھبرنا مت میں سب سنبھال لوں گا۔ میری ایک بات دماغ میں بٹھا لو۔ یہ صرف مائنڈ گیم کی بات ہے۔ ہم جو لوگوں کو دکھائیں گے۔ لوگ صرف اسی پر بھروسہ کریں گے۔ اور ہم اس ہی پوائنٹ کو لے کر چلیں گے۔“

”وہ تو ٹھیک مگر۔ اگر تمہارے گھر والوں۔“

”مراد، تمہیں جتنا کہا ہے اتنا کرو۔ مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔ یہ پیکٹ لو۔“ اس نے اس کی بات کاٹ کر میز سے ایک پیکٹ اٹھا کر اس کی طرف اچھالا۔ ”اس میں نئی سم اور موبائل ہیں۔ اب تم صرف یہ استعمال کرنا۔ اور کام کے بعد انہیں پھینک دینا۔ اس میں تمہارا

پاسپورٹ بھی ہے۔"

پھر اس نے مراد علی سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے نکل پڑا۔ ثاقب ٹیکسی لے کر سیدھا ہوٹل آیا۔ فریش ہونے کے بعد اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ نیلے رنگ کی ہوڈی کے نیچے بیگی جینز پہنی۔ چہرے پر گوگلز پہنے اور ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

ہوٹل کے لابی پر وہی ویٹر ملا۔ جس سے اس نے اس لڑکی کی انفارمیشن لانے کو کہا تھا۔

"سر آپ جا رہے ہیں۔" وہ لڑکی۔ آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ابھی میں جلدی میں ہوں۔ اگلی بار مل کر پکا پارٹی کریں گے۔" ثاقب بیگ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔ پھر وہ ٹیکسی سے ایئر پورٹ پہنچا۔ وہاں کی فلائٹ سے سیدھا چائنہ پہنچا۔ اس کے ایک اور فرینڈ نے اسے پک کیا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

"یار، اتنی کیا جلدی تھی۔ ہم مل تو رہے تھے۔" اسے کافی کا کپ دیا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے پر اب پلان میں ایک تبدیلی ہے۔ تم کل کی سیٹ کروا لو۔ بس کوئی سوال مت پوچھنا۔" گیلا تولیہ کرسی کے پیچھے ڈالا۔ دوسری کرسی کھینچ کر اس پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"پر یار اتنی جلدی؟" اپنی عینک کو اوپر کیا۔

"کہا نا کوئی سوال نہیں۔ تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔ ایک بار یہ کام ہو جائے۔ تب جا کر مجھے سکون ملے گا۔" ثاقب بیگ نے اپنی بھنویں سکیڑیں۔

"صرف سکون ملے گا" اس کا سوالیہ انداز تھا۔

"اپنی بے عزتی کا بدلہ ملے گا۔ وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب سب کے سامنے۔" میز پر زور سے مکا مارا۔

”جیسے تیری مرضی تیرے بڑے احسانات ہیں مجھ پر۔ جب میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔تم مجھے ہسپتال لے کر گیا۔ میرا سارا خرچہ اٹھایا تھا۔ میں ابھی ٹکٹ بک کرواتا ہوں۔ پہلے باہر چلتے ہیں کچھ کھانے کے لیے۔“ وہ کرسی سے اٹھا۔

”نہیں تم یہی پر منگوالو۔ مجھے تمہارے ساتھ بہت اہم پوائنٹس ڈسکس کرنے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔ میں کھانا یہیں آڈر کرتا ہوں۔ باہر ویسے بھی بہت برف باری ہو رہی ہے۔“

شام تک دونوں باتوں میں مصروف رہے۔ اگلے دن انہیں دوسرے ملک جانا تھا۔اس لیے سونے کے لیے جلدی لیٹ گئے۔ اس کا دوست تو سو گیا۔ پر ثاقب بیگ کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ صرف اپنے پلان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆......☆......☆

سخت سردی کا مہینہ تھا۔ سکول میں سردیوں کی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ ستارہ اپنی سٹڈی ٹیبل پر بیٹھی امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس نے بالوں کو تیل لگا کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔ سبز رنگ کی شلوار قمیص کے ساتھ کالے رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ گلے میں پھولوں والا مفلر تھا۔

”یہ لو میری بیٹی ستارہ۔ دیکھو تمہارے لیے کیا لے کر آیا ہوں۔ میری بیٹی کی فیورٹ برفی۔“

”شکریہ بابا۔ آپ کو یاد تھا۔“

ستارہ اپنی کتابیں چھوڑ کر اپنے بابا کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ مٹھائی کا ڈبہ اپنے گود میں رکھ لیا۔

”مجھے اپنی پیاری بیٹی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ پر آج کل تو وہ نظر ہی نہیں آتی۔“ ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''بابا! بورڈ کے امتحانات بہت نزدیک ہیں۔ بس اس ہی میں مصروف رہتی ہوں۔ اگر نمبر کم آئے تو کالج میں ایڈمیشن مشکل سے ہوگا۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ میری بیٹی کتنی محنت کرتی ہے۔ انشاءاللہ بورڈ میں ٹاپ کرے گی۔'' اپنی بیٹی کے سر پر پیار دیا۔ ''ویسے امتحانات کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟''

''ابھی تو اچھی جا رہی ہے۔ آپ بس دعا کرنا۔''

''ستارہ، ادھر آؤ۔ میری ذرا کچن میں مدد کرنا۔'' یہ بھابھی سندس کی آواز تھی۔ جب سے بیاہ کر آئی تھی۔ ذرا ذرا سے کام کے لیے ستارہ کو آواز دینے لگتی۔ اور اگر ستارہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے نہ جاتی تو سندس ایک منٹ بھی نہ لگاتی اور پورا گھر سر پر اٹھا لیتی۔

''بابا! میرے پیپرز نزدیک ہیں۔ اور بھابھی جان بوجھ کر چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے مجھے بلاتی ہیں۔ میری پڑھائی کا بہت حرج ہوتا ہے۔ آپ سلیم بھائی سے بات کریں ناں۔''

''بیٹا کوئی بات نہیں۔ تم اس کی بات سن لیا کرو۔ اگر میں بات کروں گا تو اس سے گھر کا ماحول خراب ہوگا۔ تمہاری ماں بھی اپنے بڑے بھائی کے پاس ملتان گئی ہے۔ وہ ایک ہفتے تک آجائے گی تو سب سنبھال لے گی۔''

''آپ کب جا رہے ہیں ماما کو لینے۔''

''آج رات کو نکل جاؤں گا۔ حسن بھی ساتھ میں جائے گا۔ دو دن تک واپس آجائیں گے۔'' انہوں نے گھڑی پر ٹائم دیکھا۔

''ستارہ، سن نہیں رہی ہو جلدی کچن میں آؤ۔ اپنے باپ سے بعد میں بات کر لینا۔'' سندس پھر چیخی۔

”جا بیٹا جا کر اپنی بھابھی کی بات سن لو۔ میں مسجد جا کر نماز پڑھ آؤں۔“

چہرے پر پریشانی کے اثرات تھے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ اٹھ کر نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہ برفی کا ڈبہ بیڈ پر چھوڑ کر کچن میں آ گئی۔ کچن سارا بکھرا ہوا تھا۔ سنک گندے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ سندس بھابھی کچن میں کرسی بیٹھ کر اپنے موبائل پر کیک بنانے کی ریسپی دیکھ رہی تھیں۔

”اچھا ہوا تم آ گئی۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ آج تمہارے بھائی کے کچھ دوستوں نے گھر آنا ہے۔ میں ان کے لیے کیک بنا رہی ہوں۔ تم یہ ذرا سے برتن دھو دو۔“

”آپ کیک بیکری سے منگوا لیتیں۔“ ستارہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔

”میں نے تمہارے بھائی کو کہا تھا کہ کیک میں خود بناؤں گی۔ مگر یہ تو کافی مشکل لگ رہا ہے۔“ بھابھی ناک چڑھا کر بولی۔

”میرے پیپرز ہیں میرے پاس اتنا ٹائم نہیں۔“

”تمہارے پیپرز کل سے شروع نہیں ہو رہے۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔ ”مجھے اور بھی کام ہیں۔ میں سامان لینے مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ اس گھر میں ایک ہی بکواس سننے کو ملتی ہے۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ حسن کو کہا مجھے مارکیٹ لے جائے۔ اس کا بھی یہی جواب تھا۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اپنے شوہر کو بتاتی ہوں۔“ اس نے کرسی زور سے پیچھے کی اور پیر پٹختی کچن سے نکل گئی۔

اسے کچن کو صاف کرنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ستارہ کا غصے سے دماغ خراب ہو رہا تھا۔ سارا کچن گندا کر کے خود مزے سے باہر چلی گئی تھی۔ کام کچھ نہ کرتی پر بھابھی کی زبان برابر چلتی تھی۔ اور کیوں نہ چلتی اس کا شوہر سلیم ہمیشہ اپنی بیگم کا ساتھ دیتا تھا۔

اس نے کچن کا کام ختم کیا۔ بابا اور حسن گھر آئے۔ انہیں کھانا دیا اور ملتان جانے کے لیے بیگ پیک کیا۔ وہ ان دونوں کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں آئی۔ اپنے کپڑے لیے اور نہانے چلی گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ سردی اور دھند میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سفید رنگ کے ٹراؤزر کے اوپر کافی کے رنگ کی قمیض زیب تن کیے وہ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔ سلیم بھائی کے دوست آئے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم سے مسلسل شور اور خوش گپیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دروازے پر بیل ہوئی۔ ستارہ نے اپنے سر پر دوپٹہ لیا۔ اپنی کتابیں لیں اور ٹی وی ہال میں آ گئی۔ فردوس کالے رنگ کی شلوار قمیض پہنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے سر پر اونی کیپ، کندھوں پر شال اوڑھی ہوئی تھی۔ وہ سر جھکائے کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

ستارہ نے اسے سلام کیا۔ اپنی کتابیں میز پر رکھیں اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پچھلے ایک ماہ سے فردوس اسے بیالوجی کی ٹیوشن پڑھا رہا تھا۔ وہ اسد کے دوست کا چھوٹا بھائی تھا۔ اپنا سر ہمیشہ جھکا کر رکھتا۔

آج بھی اس نے ٹیوشن پڑھائی۔ حسن انکل، آنٹی گھر پر نہ تھے اس لیے فوراً چلا گیا۔ ستارہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے کھانا کھایا اور دیر رات تک پڑھتی رہی۔ چائے بنانے کے لیے کچن میں آئی۔ شکر تھا سلیم اپنے دوستوں کو لے کر باہر کھانے پر چلا گیا تھا ورنہ کچن پورا کباڑ خانہ بنا ہوتا۔ اس نے چائے اپنے کپ میں ڈالی۔ پلیٹ میں پیزا کا ایک سلائس رکھا جو سلیم بھائی لے کر آئے تھے۔ اپنی چائے اور پیزا برآمدے میں لے آئی۔ کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی۔

صحن میں دھند چھائی ہوئی تھی۔ آسمان بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ جب سخت ٹھنڈی ہوا

چلتی تو روح تک کانپ جاتی۔ ایسے میں گرما گرم چائے پینے کا الگ مزہ تھا۔ اس کا دھیان صحن کی طرف تھا۔ گرم چائے سے بھاپ اڑ رہی تھی۔

''لگتا ہے تمہیں پیار ہو گیا ہے۔'' سندس بھابھی نائٹ سوٹ پہنے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب۔'' اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''اب اتنی معصوم بھی مت بنو۔ وہ لگاتار تمہیں دیکھ رہا تھا۔ وہی جو تمہیں ٹیوشن پڑھانے آتا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہے۔'' لہجہ تلخ تھا۔

''کون سا بھائی۔ سب پہلے ایسے ہی کہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے تم بھی اس کو۔۔۔''

''اگر دوبارہ فضول بات کی تو میں بھائی کو بتاؤں گی۔'' اپنا چائے کا کپ لیا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی اور دوبارہ پڑھنے لگی۔

''پھر سے بیالوجی کی کتاب۔'' سندس بھابھی اس کی کرسی کے پیچھے کھڑی تھیں۔ ''تم نے کبھی غور سے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ہے۔ اچھی خاصی خوبصورت ہو۔ اور وہ بھی اچھا خاصا ہینڈسم ہے۔ ایک کام کرو اسے تم ایک خط لکھو۔ دیکھ لینا جواب ہاں میں آئے گا۔'' اس کے گالوں کو چھوا۔

''آپ یہاں سے چلی جائیں۔'' اس نے کتاب کو بند کر دیا۔

''میں تو چلی جاؤں گی۔ پر تم یہ موقع ہاتھ سے مت جانے دینا۔ ذرا سوچنا اس بارے میں۔ تمہاری بھابھی ہوں غلط مشورہ تھوڑی نہ دوں گی۔'' یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ستارہ کافی دیر کرسی پر یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس کا بھابھی کی باتوں کی وجہ سے پڑھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی لائٹ آف کی اور اپنے

بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ نیند اسے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ دماغ میں نہ جانے کیوں عجیب خیالات آ رہے تھے۔

"ماما آجائیں ملتان سے انہیں شکایت لگاؤں گی۔ بھابھی کو بولیں اپنی حد میں رہیں۔"

ساری رات یوں ہی گزر گئی۔ وہ صبح دیر سے اٹھی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا ناشتہ کیا اور دوبارہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ بھابھی اور سلیم بھائی اپنے میکے گئے ہوئے تھے۔

گھر پر مکمل خاموشی تھی۔ اس کا سارا دن پڑھائی میں گزر گیا۔ دوپہر کو بھابھی سندس کھانا لے کر آئیں۔ ستارہ بھی کچن میں آ گئی۔ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

"پھر کیا سوچا تم نے اس کے بارے میں۔" بھابھی نے نان کا نوالہ لیا۔

"کس بارے میں۔" ستارہ نے چٹنی اپنی پلیٹ میں ڈالی۔

"تم کتنی معصوم ہو۔ آج وہ ٹیوشن پڑھانے آئے تو اسے غور سے دیکھنا۔ بندہ بڑا فٹ ہے۔"

"آپ پھر سے شروع ہو گئیں۔ مجھے ان فضول کی باتوں کا کوئی شوق نہیں۔ آئندہ میرے ساتھ ایسی باتیں مت کرنا۔"

ستارہ نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنی کتابیں کھولیں اور پڑھنے بیٹھ گئی۔ جب سے سکول سے سردیوں کی چھٹیاں ہوئی تھیں۔ وہ زیادہ تر اپنی اسٹڈی ٹیبل پر دکھائی دیتی۔ عینی اور ستارہ نے دن فکس کیے ہوئے تھے۔ اس دن وہ دونوں اکٹھے ہو کر امتحان کی تیاری کرتیں۔

آج صبح سے سارا دن لگاتار بارش ہوتی رہی تھی۔ گیس غائب تھی اور ٹھنڈ بہت ہو گئی تھی۔ شام ہوئی بیل بجی۔ ستارہ اپنی کتابیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس نے کل والا

سوٹ پہنا ہوا تھا۔ سندس بھابھی اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ اسے باٹنی کا چیپٹر سمجھا رہا تھا۔

فردوس آج ٹریک سوٹ میں تھا۔ لیدر کی جیکٹ زیب تن تھی۔ پیروں میں سفید رنگ کے جوگرز تھے۔ سیدھے ہاتھ کی کلائی پر گولڈن رنگ کی گھڑی پہنی ہوئی تھی۔ پین ہاتھ میں لیے وہ رجسٹر پر اسے پلانٹ سیل کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

ڈرائنگ روم کی کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی سے بارش برسنے کی آواز آ رہی تھی۔

آج پہلی بار ستارہ نے اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھا۔ اس کے سفید ہاتھ پر گھڑی بہت جچ رہی تھی۔ اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے اس لڑکی نے فردوس کا سر سری سر سے پیر تک کا جائزہ لیا۔ باہر زوروں کی بجلی چمکی۔

ستارہ کو جیسے کرنٹ لگا ہو۔ اس کے بال، اس کی آنکھیں، اسکی مسکراہٹ۔ عین اس وقت فردوس نے بھی ستارہ کو دیکھا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" حلق خشک ہو گیا۔

"ہم باقی کل کر لیں گے۔ ویسے بھی میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" اس نے کتاب بند کی۔ پین میز پر رکھا، اپنا چھاتہ پکڑا اور وہاں سے نکل گیا۔ وہ ادھر بت بنی رہی۔ بائیک سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد مدھم ہو گئی۔ وہ چلا گیا۔

اس نے اپنی کتابیں پکڑیں، لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ کتابیں بیڈ پر رکھیں۔ اپنے کمرے سے گھر کی بالکونی میں آئی۔ گلی میں جھانکا، اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ بارش کے چھینٹے اس کے چہرے پر پڑے۔

وہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر اپنے

بیڈ پر پیر لٹکا کر لیٹ گئی۔

''آج یہ کیا ہو گیا؟ وہ اتنا اچانک کیوں چلا گیا۔''

''مجھے ان فضول کی باتوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے۔''

اپنے بیڈ سے جھٹکے سے اٹھی۔ اپنی کتابیں لے کر اسٹڈی ٹیبل پر پڑھنے کے لیے بیٹھ گئی۔

طبیعت کافی بجھی بجھی سی تھی۔ اس کا دل پڑھنے میں ذرا نہیں لگ رہا تھا۔

وہ کھانا کھانے کے لیے نیچے کچن میں آئی۔ سلیم بھائی اور سندس بھابھی پہلے سے کچن میں تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ پڑھنے کے لیے دوبارہ بیٹھی۔ کافی دیر تک پڑھنے کی کوشش کی پر دماغ میں کچھ بیٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ تنگ آ کر اپنی کتابیں بند کیں اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ کافی دیر تک لیٹی رہی پر نیند آج اس سے کوسوں دور تھی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتی فردوس کا چہرہ اس کے سامنے گھومنے لگتا۔

''مجھے نیند کیوں نہیں آ رہی۔ یہ فردوس کیوں میرے دماغ پر چھا گیا ہے۔ کیا۔۔ وہ۔ بھی۔ مجھے۔۔ دیکھتا۔ ہے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب بھابھی کی باتوں کا اثر ہے۔ ہم دونوں ہرگز نہیں۔''

وہ خود سوال کرتی خود جواب دیتی۔ سر میں درد ہونے لگا۔

''ویسے ہے تو وہ بہت خوبصورت۔ کیا وہ واقعی مجھے دیکھ رہا تھا۔'' دماغ میں پھر سوال اٹھنے لگے۔ تنگ آ کر اپنے بستر سے اٹھی۔ کمرے کی لائٹ آن کی اور دوبارہ پڑھنے بیٹھ گئی۔ پھر سے اس کا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔ کتابیں ادھر چھوڑ کر نیچے کچن میں آئی چائے بنانے کے لیے۔ ساس پین میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔ دوسرے چولہے پر نوڈلز بنانے کے لیے پانی رکھا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟'' سندس کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔

''جی ٹھیک ہے۔'' بنا مڑے جواب دیا۔

''وہ ساسو ماں کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ان سب کو آنے میں نو دس دن لگ جائیں گے۔''

''اچھا'' اماں آجاتی تو میرا دل لگ جاتا۔ دل میں خیال اٹھا۔

''تم نے دیکھا اسے؟''

''میرے پاس فالتو وقت نہیں۔ آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ میرے ساتھ فضول کی باتیں نہ کریں۔'' چائے اپنے کپ میں ڈالی۔

''میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ آخر شادی تو تم کو کرنی ہے۔ وہ اچھا خاصا ہے۔ ہم دونوں کی فیملیز بھی ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کسی کو اعتراض ہوگا۔''

ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی نوڈلز، چائے کا کپ ڈش میں رکھے۔ اپنی ڈش لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سندس کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔

اپنی ڈش بالکونی میں لے آئی۔ خود پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گئی اور ڈش کو گود میں رکھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ تیز ہواؤں کے ساتھ بجلی اب بھی چمک رہی تھی۔

''ہم دونوں کی فیملیز ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔'' بھابھی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

اپنی چائے کا ایک سپ لیا۔ سر جھکائے گہری سوچوں میں گم تھی۔

"مجھے صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دینی چاہیے۔کل عینی کی طرف جاؤں گی۔اس کی بہن کی شادی اگلے ہفتے ہے۔ان کی شادی سے پہلے میتھ کے کچھ سوالات سمجھ لوں۔بعد میں پتا نہیں کب موقع ملے گا۔"

اپنی چائے اور نوڈلز ختم کر کے اپنے کمرے میں آئی۔رات کافی ہو چکی تھی۔نیند بھی آ رہی تھی۔بیڈ پر لیٹی، اپنی رضائی لی۔جیسے آنکھیں بند کیں۔فردوس کا چہرہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔ڈر سے اپنی آنکھیں فوراً کھولیں۔کروٹ بدلی، دوبارہ سونے کے لیے آنکھیں بند کیں۔پھر وہی چہرہ، وہی آنکھیں۔اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یا اللہ۔یہ فردوس میرے حواسوں پر کیوں چھا گیا ہے۔"

ایک بار پھر سونے کے لیے لیٹی۔وہی چہرہ بار بار دکھائی دیتا۔ساری رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔صبح فجر کے وقت گہری نیند سو گئی۔

☆......☆......☆

یہ پہلی جنوری کی پہلی شام تھی۔موسم بے حد سرد تھا۔ساری رات بارش ہوتی رہی۔بارش ختم ہوئی تو دھند پڑنے لگی۔سورج بھی کئی ہفتوں سے غائب تھا۔موسم میں عجیب سی اداسی تھی۔شام کے وقت پروفیسر شکیل رضا ہاشمی کے بنگلے پر آج بہت خاموشی تھی۔شاہدہ بیگ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پارٹی پر گئی ہوئی تھی۔آج رات تیمور کی فلائٹ تھی۔اس کے فادر اس کے امریکہ جانے سے ذرا خوش نہیں تھے۔پچھلے ہفتے اس وجہ سے دونوں باپ بیٹے میں بہت بحث بھی ہوئی تھی۔آخر کار شکیل رضا کو اپنے بیٹے کی ضد کے آگے جھکنا پڑا۔

"آج تو بڑے خوش ہو۔" سگریٹ کا دھواں اپنے منہ سے نکالا۔"ویسے جانی مجھے لگتا ہے ہماری جلد ہی ملاقات ہو گی۔"

"ہاں خوش تو میں بہت ہوں۔ پر مجھے نہیں لگتا ہم جلد ملیں گے۔ ہاں اگر تم فون کرلو گے تو میں بات کرلیا کروں گا۔"

"اچھا میں تم کو فون کروں گا تو تم بات کرو گے۔ دیکھتے ہیں۔" وسیم نے جلتا سگریٹ زمین پر پھینکا۔ اس پر اپنا پیر رکھ کر مسل دیا۔

"لگتا ہے پاکٹ منی بڑھ گئی ہے۔ جلتا سگریٹ ضائع کردیا۔ میز پر ایک اور پیکٹ پڑا ہے اس سے نکال لے۔"

وسیم تیمور کے گھر اس کے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں تیمور پر جمی تھیں۔ آج رات تیمور کی فلائٹ تھی۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال سیٹ کررہا تھا۔ جینز کے اوپر جیمز بانڈ کی شرٹ زیب تن تھی۔ بیڈ سے اپنی جیکٹ اٹھا کر پہنی۔

"یہ پستول کس کی ہے۔ کافی مہنگی لگتی ہے۔" ہاتھ سے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"گفٹ ہے۔ اگر لائسنس ہوتا تو ساتھ لے جاتا۔ پر وہاں میرے کس کام کی۔ کس کو گولی مارتا۔"

"اور ادھر۔ کس کو گولی مارتا؟"

"پہلی گولی تجھے ہی مارتا۔" تیمور نے گن اٹھا کر وسیم کی طرف رخ کیا۔ "ہاہاہا۔ مذاق کر رہا تھا۔ تجھ پر اپنی گولی تھوڑی نہ ضائع کروں گا۔" گن واپس بیڈ پر پھینک دی۔

"دشمن، کرسٹل، روبی، ڈیزی ان سب سے نہیں ملے گا۔" بچپن کے دوست نے پھر بات بدل دی۔

"نہیں۔ ایک بار مل تو لیا ہے اب کتنی بار ملوں۔"

"وقت کا کیا پتا کب کہاں کوئی مل جائے۔ کس کی ضرورت کب پڑ جائے۔" وہ صوفے پر

ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''ضرورت۔ تیمور شکیل رضا کو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے اپنے برانڈڈ شوز پہنے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ وسیم نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

''وہ بڑے صاحب چھوٹے صاحب کو نیچے بلا رہے ہیں۔'' لیلیٰ نے پیغام دیا اور فوراً وہاں سے چلتی بنی۔

''اب میں بھی چلتا ہوں مجھے لگتا ہے ہم جلد ملیں گے۔'' وسیم دروازے سے ہی نکل گیا۔

تیمور اسے نظر انداز کر کے واش روم گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا۔ ڈرائیور اس کے دونوں سوٹ کیس گاڑی میں رکھنے کے لیے لے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا، کمرے پر نظر ڈالی زینے اتر کر نیچے آیا۔

شکیل رضا ہاشمی ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈریس پینٹ کے اوپر لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا۔ میز مختلف کھانوں کی لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ لیلیٰ سرونٹ کوارٹر میں تھی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔

''آؤ بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' اپنے ہاتھ سے پاس والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''اب پلیز کوئی لمبا لیکچر مت دینا۔ میرا موڈ خراب مت کرنا۔'' اپنے موبائل پر مصروف وہ پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''جلدی بولیں کیا بات ہے۔''

''بیٹا تیمور۔ جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اس ہی سے اپنی زندگی کو سنوارنا اور جو تمہارے ہاتھ میں نہیں، اس کے پیچھے مت بھاگنا۔'' سر جھکائے سوچ سوچ کر ایک لفظ بول رہے تھے۔

''اور کچھ۔'' پلیٹ سے کباب اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالا۔ دھیان موبائل کی طرف تھا۔

''چند گھنٹوں میں تمہاری فلائٹ ہے۔ نہ جانے اب ہم کب ملیں یا شاید۔''

''پلیز اب آپ جذباتی مت ہوں۔'' وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ڈرائیور کو بولیں گاڑی نکالے۔ دھند کی وجہ سے اکثر سڑکیں ویسے ہی بلاک ہیں۔ میں ہاتھ دھو کر آیا۔'' وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر واش روم جانے لگا۔

''اچھا ایک بار گلے تو مل لو۔'' شکیل رضا ہاشمی اپنی کرسی سے اٹھے۔ اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلایا۔

تیموران کو نظرانداز کر کے واش روم گھس گیا۔ بس ادھر سے اس کی زندگی پلٹ گئی۔ جیسے ہی وہ ہاتھ دھو کر واپس ٹی وی ہال میں پہنچا ایک آواز سے اس کی روح کانپ گئی۔

پستول کی گولی کی آواز آئی۔ ڈائننگ ٹیبل کے پاس شکیل رضا ہاشمی کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ گولی سیدھی دل پر لگی تھی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ سارا فرش خون سے بھرا ہوا تھا۔

''بابا!'' تیمور کے لفظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ وہ ادھر بت بن گیا۔ موبائل فون اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ لڑکھڑاتے قدم چل کر اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ فائرنگ کی آواز پورے بنگلے میں گونجی تھی۔ آواز سن کر ڈرائیور، چوکیدار، لیلیٰ گھر کے اور نوکر بھی وہاں پہنچے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر ان سب پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔

پروفیسر شکیل رضا ہاشمی اس دنیا میں نہیں رہے۔ تیموران کی لاش کے پاس بیٹھا ایمبولینس لانے کے لیے چلایا۔ عین اس موقع پر شاہدہ بیگ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ گھر پہنچی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر وہ ادھر فرش پر بیٹھ گئی۔

لیلیٰ، موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا کو اندر کمرے میں لے گئی۔ چوکیدار نے پولیس کو فون کر دیا۔ تیمور کے دونوں ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں میں پولیس وہاں پہنچ گئی۔

پولیس کے سائرن کی آواز سے وحشت ہو رہی تھی۔ ڈی ایس پی آفتاب نے پوری جگہ کا خود معائنہ کیا۔ ان کو لاش کے پاس ایک گن ملی۔ جو انہوں نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ ساتھ میں اس کا موبائل بھی قبضہ میں لے لیا۔ پورے گھر کی تلاشی شروع ہو گئی۔ ایمبولینس کے دو اہلکاروں نے پروفیسر شکیل رضا ہاشمی کی لاش کو اسٹریچر پر ڈالا۔ تیمور اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

اس کے فادر کو ہسپتال پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے۔ گھر کے سب نوکروں سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔ ایک لیڈی پولیس کانسٹیبل نے شاہدہ بیگ کو صوفے پر بٹھایا۔

ڈی ایس پی آفتاب تیمور کے پاس زمین پر پیروں کے بل بیٹھے۔ وہ چودہ سالہ لڑکا اپنے حواسوں میں بالکل نہ تھا۔

"کیا تم یہاں سب سے پہلے پہنچے تھے؟" لہجہ سخت پولیس والے جیسا تھا۔

اس سے پہلے تیمور کچھ بولتا وہ ادھر فرش پر بے ہوش ہو گیا۔ ڈی ایس پی آفتاب نے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا۔

"اس کو فی الحال ہسپتال لے جاؤ۔ اس پر کڑی نگرانی رکھنا۔ جیسے ہوش آئے سب سے پہلے مجھے کال کرنا۔ گھر کے سب نوکروں سے سختی سے تفتیش کرو۔ شاہدہ بیگ ابھی اس حالت میں نہیں۔ ان کو صبح تھانے لے کر آنا۔ اور فرانزک والوں سے کہو ہمیں جلد سے جلد رپورٹ دیں۔" وہ کچھ دیر وہاں رکا اور پھر وہاں سے نکل گیا۔

اگلی صبح یہ خبر پورے شہر میں آگ کی طرح پھیلی۔ میڈیا چینلز اور سوشل میڈیا پر یہی خبریں چل رہی تھیں۔ ہر کوئی اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا۔

تیمور ہسپتال میں تھا۔ اس کا نروس سسٹم بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ ابھی بھی میڈیکل آبزرویشن میں تھا۔ نرس اسے ڈرپ لگا رہی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ نرس نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر کے ساتھ ایک پولیس والا اندر آیا۔ ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرنے لگا۔

"اب کیسا ہے؟ ڈی ایس پی بس یہاں پہنچ رہے ہیں۔ بڑا پریشر ہے اوپر سے۔" پولیس والا اپنے دیسی لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر بغیر کچھ بولے تیمور کا معائنہ کر کے وہاں سے چلا گیا۔ نرس بھی ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گئی۔ پولیس اہلکار ادھر سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے ریموٹ پکڑا اور اونچی آواز میں ٹی وی آن کیا۔

ٹی وی پر پروفیسر شکیل رضا ہاشمی کی نیوز چل رہی تھی۔ تیمور کا دھیان ٹی وی کی طرف گیا۔ جو خبر اس کے سماعتوں میں پڑی۔ اس کو بجلی کا جھٹکا لگا۔ پروفیسر شکیل رضا اور تیمور کی تصویریں ٹی وی سکرین پر چل رہی تھیں۔ تیمور کی تصویر میں اس نے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں ایک گن پکڑی ہوئی تھی۔ نیوز رپورٹر چیخ چیخ کر بتا رہی تھی۔

"پروفیسر شکیل رضا ہاشمی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کا قتل ہوا ہے۔ اور ان کا قاتل ان کا اپنا سگا بیٹا تیمور شکیل رضا ہاشمی ہے۔ پولیس کو کرائم سین پر ایک پستول بھی ملی ہے۔ جس پر ان کے بیٹے کے فنگر پرنٹ کے نشان ملے ہیں۔ لگتا ہے کوئی آپسی رنجش کا نتیجہ ہے۔"

نیوز رپوٹر نے ایک سینئر صحافی کو فون لائن پر لیا۔

''سر! اگر بیٹا مجرم ہے۔ تو اسے کیا سزا ملے گی۔ اس کی عمر ابھی چودہ یا پندرہ سال ہے۔''

اس سے پہلے صحافی کوئی جواب دیتا۔ پولیس اہلکار نے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ سٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے صرف نیوز سنانے کے لیے ٹی وی آن کیا تھا۔ دروازہ کھلا، ڈی ایس پی آفتاب اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ اور پولیس اہلکار بھی تھے۔

''اسے ہوش آیا۔'' اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے۔

''سر! ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' پولیس اہلکار فوراً کھڑا ہوا۔

''ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے میری۔ کہہ رہا تھا ابھی تک شاک میں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اس پر سخت نگرانی رکھو۔ اپنے باپ کا قتل کر کے کتنے آرام سے لیٹا ہوا آرام فرما رہا ہے۔ ایک بار بیٹا میرے ہاتھ چڑھو۔'' مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس پولیس اہلکار کو اور ہدایت دے کر چلا گیا۔ وہ پولیس اہلکار واپس اپنے سٹول پر بیٹھ گیا۔

''ہوں۔ امیر باپ کی بگڑی اولاد۔ اللہ ایسی اولاد کسی کو نہ دے۔''

تیمور کی بس سانس چل رہی تھی۔ وہ زندہ لاش بن گیا تھا۔ جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ پر دماغ میں ایک طوفان چل رہا تھا۔

''بابا۔ کا۔ قاتل۔۔۔ میں۔۔۔ بابا۔ قاتل۔''

صرف ایک لمحے میں تیمور شکیل رضا کی زندگی بدل گئی۔ تمام فیصلے اور پلاننگ صرف اللہ کی ذات کرتی ہے۔ بندوں کے ہاتھ کچھ نہیں ہوتا۔ تقدیر کا لکھا ہو کر رہتا ہے۔

☆......☆......☆

''تم جب بھی صفائی کے لیے آتی ہو۔ باہر کھڑے ہو کر یونیورسٹی کو گھورتی کیوں ہو؟''

”ایسے ہی۔آپ نے کیوں بلایا تھا؟“ نوربی بی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کل تمہاری طبیعت خراب تھی؟ میڈیسن لی ہے اب طبیعت کیسی ہے۔“

”پہلے سے بہت بہتر ہے۔بس دل پر بوجھ ہے۔“

”ہاں وہ تو مجھے دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔“

پروفیسر حلیمہ اپنے آفس میں بیٹھی تھیں۔میز پر کچھ کتابیں کھلی تھیں۔وہ یقیناً اگلے لیکچر کی تیاری کر رہی تھیں۔ان کو اس یونیورسٹی میں آئے اور جاب شروع کیے صرف دو ماہ ہوئے تھے۔نوربی بی یہاں چند سالوں سے ماسی کا کام کر رہی تھی۔پروفیسر حلیمہ میں کچھ تو ایسی کشش تھی۔جس کی وجہ سے نوربی بی نے اپنے ماضی کے بارے میں انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ان دونوں کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

نوربی بی ان کے سامنے بیٹھی تھی۔چھت پر لگا پنکھا ہلکی سپیڈ سے چل رہا تھا۔آفس میں لگی بڑی سی کھڑکی سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ انسان کے پاس تیرہ قسم کے دل ہوتے ہیں۔“ اپنی انگلی پر یاد کرنے کی کوشش کی۔”وہ جو تکلیف پر خوش رہتے ہیں۔اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔وہ۔“

”تم قلب مہدی کی بات کر رہی ہو۔نوربی بی میں تمہاری زندگی سے اچھی طرح واقف ہوں۔تم کیوں ہمت ہار رہی ہو۔دیکھو ہمارے جتنے بھی انبیاء، پیغمبر اور نبی تھے۔ان سب کی زندگی میں بھی تکلیفیں آئی تھیں۔اور ہم، ہم سب عام سے انسان ہیں۔تم صرف ایک کام کرو۔“ پروفیسر حلیمہ اپنے نام کی طرح دھیمے مزاج کی تھیں۔

”وہ کیا؟“ نوربی بی کے ماتھے پر بل پڑے۔”میں نماز تو پڑھ لیتی ہوں۔پر دعا نہیں مانگتی ہوں۔جب میں اتنی مشکل میں تھی تو میں نے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔اللہ نے میری ایک دعا

بھی قبول نہیں کی تھی۔'' بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''تم ابھی صرف ساتویں دل قلب مطمئن پر عمل کرو۔بس ہر وقت درود شریف پڑھو۔ کثرت سے استغفار کرو۔اپنے دل کو پتھر مت بناؤ نور بی بی۔ اللہ تمہاری مشکل ضرور دور کرے گا۔وہ کسی انسان پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔تمہیں قرآن پاک کی ایک آیت سناتی ہوں۔'' شیلف سے ایک کتاب اٹھا کر کھولی۔

''جی۔''

''سورۂ طہٰ میں اللہ فرماتے ہیں۔تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔وہ نہ بھٹکے گا اور نہ آخرت میں تکلیف اٹھائے گا۔اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا۔تو میں اس کی زندگی سے سکون چھین لوں گا۔تمہیں آسان لفظوں میں سمجھاتی ہوں۔ جو اللہ کی باتوں اور حکم پر عمل کرتا ہے۔اس کے احکامات پر عمل کرتا ہے۔اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔وہ کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔جیسے جو لوگ نماز پڑھتے ہیں۔روزے رکھتے ہیں۔غلط اور فضول باتوں سے دور رہتے ہیں۔بے حیائی سے دور رہتے ہیں۔اور سب سے بڑھ کر حقوق العباد پر عمل کرتے ہیں۔کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ہر کسی سے حسن سلوک سے پیش آتے ہیں۔سادگی اختیار کرتے ہیں۔وہ کبھی نقصان یا تکلیف نہیں اٹھاتے۔جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔وہ کبھی منزل سے نہیں بھٹکتے۔

اللہ نہ صرف دنیا میں ان پر اپنا کرم فرمائے گا بلکہ آخرت میں بھی ان پر اپنی رحمت فرمائے گا۔تمہیں پتا ہے نا قیامت کیسی ہوگی۔ہم سب کی اصل زندگی تو وہاں سے شروع ہوگی۔یہ دنیا اور اس کی تکلیفیں صرف عاجزی ہیں۔بس جو لوگ اللہ کے حکم پر چلیں گے۔ان کے لیے آخرت میں پل صراط پر آسانی ہوگی۔

دیکھو نور! شاید ابھی تم ان باتوں پر زیادہ دھیان نہ دو۔ مگر ہماری زندگی کی حقیقت ہمارے مذہب میں پوشیدہ ہے۔ جو اس کے حکم پر عمل کرے گا۔ وہ فلاح پائے گا، کامیابی پائے گا۔ جو اس کی تعلیمات سے دور ہوگا۔ وہ انسان ذلیل وخوار ہوگا۔ اس کی زندگی سے سکون ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے درود شریف کو اپنی زندگی کا حصہ بنالو۔ تم دیکھ لینا بہت جلد تمہارے دل سے یہ بوجھ ختم ہو جائے گا۔ تمہیں سکون ملے گا۔ تم ماضی کو بھولنے کی کوشش تو کر ہی سکتی ہو۔ استغفار پڑھو اس سے تمہیں بہت مدد ملے گی۔"

"آپ کو نہیں پتا میں نے کیا کھویا ہے۔ مجھے خوف کے مارے اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی۔ میرا دل کرتا ہے میں کہیں چھپ جاؤں۔ یا چیخیں مار مار کر روؤں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے میں کہاں جاؤں۔ کس کو اپنا دکھ سناؤں۔ مجھ پر جو سب سے بڑا الزام لگا ہے۔" نور بی بی بات کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو مسل رہی تھی۔ آنکھوں میں دکھ صاف نظر آرہا تھا۔

"نور! تم صرف درود شریف پڑھو۔ ٹرسٹ می تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔" اپنے دونوں بازو میز پر رکھ کر آگے ہو کر بولی۔

"اور جو الزامات مجھ پر لگے ہیں۔ ان کو کون مٹائے گا میرے اپنے۔ میری عزت کو بازار میں اچھالا گیا۔ کیا میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"نور! سب سے پہلے تم ان لوگوں کی فکر کرنا ابھی چھوڑ دو۔ صرف اللہ سے رابطہ کرو، اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور نور بچے۔ یاد رکھو تقدیر، قسمت کا شکوہ نہیں کرتے۔ یہ شیطان کی چال ہے۔ اس کے شکنجے میں مت پھنسو۔ پہلے وہ پیار سے انسان کو سینے سے لگاتا ہے۔ پھر انسان کو مایوسیوں کے اندھیرے میں لے جاتا ہے۔ شیطان انسان کو اللہ سے دور کرتا ہے۔ تم صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ اللہ نے سکون بھی دین میں رکھا ہے۔ اور عزت بھی دین میں رکھی

ہے۔ وہ ذات صرف کن کہتی ہے اور ہو جاتا ہے۔ تم بس اپنے دل کو مضبوط رکھو۔ اللہ بہت غفور ورحیم ہے۔ وہ ذات تمہاری ساری پریشانیاں دور کردے گی۔" اس کے لہجے میں بہت مٹھاس اور اپنائیت تھی۔

"میڈم جی! گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا۔ جو میں نے کھویا ہے وہ کیسے واپس آئے گا۔ میرے گھر والے میری شکل دیکھنا پسند نہیں کرتے۔" آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں سمجھ سکتی ہوں۔ جو وقت گزر گیا وہ واپس نہیں آسکتا۔ تم اپنے گھر والوں سے دور ہو گئی ہو تو تم اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ وہ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔"

"اللہ اگر چاہے تو سب ہو گا۔ اور اگر۔" دوپٹہ سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں بولی۔

"ارے بچے ایسا نہیں کہتے۔ اگر مگر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہی ایک ذات تو ہے جو سب کچھ کر سکتی ہے۔ وہ ذات تو شیطان کو حکم دے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ تم بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ ہر وقت درود پڑھتی رہو۔ تمہیں راستے خود بخود نظر آئیں گے۔ ان رشتوں کی پرواہ نہ کرو۔ جس کے ساتھ اللہ کی ذات ہو۔ اس انسان کو کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ تم بس اللہ سے دوستی کرلو۔ تمہارے دل کا بوجھ دور ہو جائے گا۔"

"میری دکھ اور تکلیفیں بہت زیادہ ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں اس بوجھ کے تلے دب کر مر جاؤں گی۔" وہ اپنی کرسی سے اٹھی۔ "مجھے آڈیٹوریم جانا ہے۔ کل وہاں شاید کوئی سمینار یا ورک شاپ ہے۔ مجھے کافی کام ہے۔"

"نورا! اللہ پر بھروسہ کرو۔ درود شریف پڑھو۔ تمہارے پاس کیا کوئی اور آپشن ہے۔ جس سے تمہاری پریشانیاں دور ہو جائیں۔" پروفیسر حلیمہ نے اپنی کتاب بند کی۔ کتاب کو اپنے ہینڈ

بیگ میں رکھا۔

''آپ نہیں سمجھیں گی۔ جب زندگی آپ سے کھیل کھیلتی ہے۔ جب آپ کے خواب ٹوٹتے ہیں۔ جب اپنے آپ پر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔''

وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پر خاموش ہو گئی۔ اس کے زخم اب بھی تازہ تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اندھیری گلی میں بند کر لیا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے آفس کا دروازہ کھلا۔ پروفیسر حلیمہ نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔

''نور بی بی! اللہ پر بھروسہ کرو۔ ٹرسٹ می وہ سب ٹھیک کر دے گا۔''

نور بی بی نے زخم میں سر ہلایا۔ دروازے کے باہر سے اپنا جھاڑو لیا۔ دروازہ کو آرام سے بند کیا۔ پروفیسر حلیمہ کو اس کے لیے بہت برا لگا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اتنا کچھ برداشت کرنا پڑا۔ اس کے لیے کرنا چاہتی تھیں۔ پر اس سے پہلے اسے اندھیروں سے نکالنا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ لہنگا بہت پیارا ہے۔ زینی آپی اس لہنگے میں کتنی پیاری لگیں گی۔'' ستارہ نے لہنگے کو چھو کر دیکھا۔

''ہاں آپی، پر آسمانی رنگ بہت پیارا لگتا ہے۔ جو دانش بھائی ہیں نا۔ آپی کے ہونے والے شوہر انہوں نے خاص کہا تھا۔ جو زینی کو لہنگا پسند آئے وہی خریدنا۔ پتا ہے ان کی لو میرج ہو رہی ہے۔'' عینی نے ستارہ کے کان میں دھیرے سے کہا۔

ستارہ عینی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ دونوں زینی آپی کی شادی کی شاپنگ دیکھ رہی تھیں۔

''لو میرج۔ وہ کیسے؟'' ستارہ کو تجسس ہوا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی شادی کی شاپنگ دیکھ رہی تھی۔

''ارے آپی جاتی تھیں نہ مولوی صاحب کے گھر بچوں کو پڑھانے کے لیے۔ بس وہیں

سے یہ پیار شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی بیگم کے بھائی ہیں دانش۔ وہ چھپ چھپ کر آپی کو دیکھتے تھے۔ کبھی ہمت نہیں ہوئی کہنے کی۔ بس مولوی صاحب کو پتا چل گیا۔ وہ اوران کی بیگم رشتہ لے کر آ گئے۔ امی کو بھلا کیا اعتراض ہونا تھا۔ وہ تو پہلے ہی آپی کے رشتے کے لیے فکرمند تھیں۔ ہم دونوں کی فیملیز ایک دوسرے کو پہلے سے جانتی تھیں۔ امی کہہ رہی تھیں۔ اللہ ایسے ہی رشتے جوڑتا ہے۔'' عینی ایسے بتا رہی تھی۔ جیسے کوئی ڈرامے کی کہانی ہو۔

''آپی کو پتہ تھا دانش بھائی انہیں چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں۔'' ستارہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ انہوں نے آپی کو خط بھی لکھے ہیں۔'' عینی کمر پر ہاتھ رکھ کر شرارتاً بولی۔ ''ویسے شریف لڑکے ایسے ہی کرتے ہیں۔ بس چھپ چھپ کر دیکھتے ہیں۔ ہمت نہیں ہوتی بولنے کی۔ ویسے نہ امی بہت خوش ہیں۔ جب فیملیز ایک دوسرے کو پہلے جانتی ہوں تو کتنی آسانی ہو جاتی ہے۔ تم بیٹھو آج چائے کے ساتھ مٹھائی کھاتے ہیں۔'' لہنگے کو بکس میں واپس رکھا۔ بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے کے بعد کچن میں گھس گئی۔

آنٹی اور زینی گھر پر نہیں تھیں۔ وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی تھیں۔ ستارہ نے بیڈ پر پڑے لہنگے کے ڈبے اور باقی شاپنگ پر نظر ڈالی۔ عینی کچن میں مصروف تھی۔ ایک شاپر سے لال رنگ کا دوپٹہ نکال کر دیکھا۔

''دانش بھائی چھپ چھپ کر آپی کو دیکھتے تھے۔ فیملیز ایک دوسرے کو پہلے سے جانتی تھیں۔'' عینی کے الفاظ ستارہ کو دوبارہ سنائی دیے۔

''میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اگر فردوس اور میں ایک ہو جائیں۔''

''ارے تمہیں کیا ہوا۔ کن خیالوں میں گم ہو۔ کیا تمہیں بھی دلہن بننے کا شوق ہے۔'' عینی

نے چائے کی ڈش اور مٹھائی میز پر رکھی۔

ستارہ کو پتا ہی نہیں چلا کب اس نے اس دوپٹے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔عینی کی بات پر وہ تیر کی طرح سیدھی ہوئی۔دوپٹے کو واپس بیگ میں ڈالا۔وہ بھی عینی کے پاس آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ایک بات پوچھوں۔کیا کسی کو پسند کرنا بری بات ہے؟''ستارہ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔نہ جانے عینی کیا سوچے۔ایک برفی کا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔

''کسی کو پسند کرنا کون سی بری بات ہے۔یہی بات مولوی صاحب نے بھی کی تھی۔اب دل پر کسی کا قابو تو نہیں۔جیسے مجھے دیکھ لو۔مٹھائی کا ڈبہ دیکھ کر میرا ہاتھ ہی نہیں رکتا۔دل کرتا ہے ساری ابھی کھا جاؤں۔''ایک گلاب جامن بڑے مزے سے اپنے منہ میں ڈالا۔

''بس کر ذرا سی ڈائٹنگ ہی کر لے۔''ستارہ نے اس کے ہاتھ پر تھپڑ مارا۔

''پورے ایک ہفتے بعد شادی ہے۔ایک ہفتے میں کیا ڈائٹنگ کرنی۔ویسے بھی زندگی کا کیا بھروسہ۔''اس نے چائے کا سپ لیا۔''یہ بتا تمہاری امی کب آ رہی ہیں،شادی پر تو آئیں گی نا؟''

''کچھ پکا کہہ نہیں سکتی۔دیکھو کب آتی ہیں۔ویسے ہمارے پیپرز بھی نزدیک ہیں۔شادی کی وجہ سے تمہاری پڑھائی کا کافی حرج ہوگا۔شکر ہے سلیم بھائی کی شادی پہلے ہوگئی۔''

''کوئی نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔مجھے کون سا ڈاکٹر بننا ہے۔جو میں پیپرز کی اتنی فکر کروں۔ایک دن تو سب نے مر ہی جانا ہے۔''خالی چائے کا کپ میز پر رکھا۔

''یہ تم مرنے کی باتیں کیوں کرتی ہو۔''ستارہ کے ماتھے پر بل پڑے۔

''کچھ نہیں ایسے ہی۔تم بتاؤ پیپرز کی تیاری کیسے چل رہی ہے۔''ہمیشہ کی طرح بات ٹال دی۔ستارہ نے بھی اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

''پیپروں کی بات چھوڑو۔تم نے شاہد کپور کی فلم دیکھی ہے۔اس کے گانے کتنے مزے

کے ہیں۔"

"یہ تم ہو۔ جو پیپروں کے قریب فلم دیکھ لیتی ہو۔ میری امی تو میری جان ہی نکال دیں۔ تم نے کب سے اتنی فلمیں اور ڈرامے دیکھنا شروع کر دیے؟" عینی غصہ ہوئی۔

"بہت سی فلمیں اور ڈرامے بھابھی نے بتائے ہیں۔ ویسے وہ اتنی بری بھی نہیں ہیں۔ اب میں بھی کچھ فلمیں دیکھ لیتی ہوں۔ امی بھی یہ بات اچھے سے جانتی ہیں۔ پہلے بہت سختی کرتی تھیں۔ اب تنگ آ کر انہوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آج رات ایک انگلش فلم دیکھوں گی۔ اسد بھائی کے کمرے کا یہی فائدہ ہے۔ سردیوں کی بارش میں مووی دیکھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔

"تمہارے بڑے عیش ہیں۔ ویسے اپنی بھابھی سے بچ کر رہنا۔ کافی تیز اور چالاک چیز ہے۔ مجھے ویسے بھی ان چیزوں کا کوئی شوق نہیں۔ بس کبھی کبھی گانے سن لیتی ہوں۔ آپی کی شادی کے لیے چند گانے ریکارڈ کیے تھے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی، دراز سے ایک کیسٹ نکالی۔ "تمہیں جو بھی شادی کے گانے یاد ہوں یا پسند ہوں۔ اس کیسٹ میں ڈال دینا مجھے اور بھی بات کام ہیں۔" اس نے کیسٹ ستارہ کو تھما دی۔

دونوں نے شادی کے گانوں کی لسٹ بنائی۔ آنٹی اور زینی بھی گھر واپس آ گئے۔ کچھ دیر مزید رکنے کے بعد ستارہ واپس اپنے گھر آ گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ سندس بھابھی سلیم بھائی کے ساتھ اپنے میکے چلی گئی۔ اتوار، چھٹی کا دن تھا۔ فردوس نے نہیں آنا تھا۔ ستارہ نے فون پر اپنی امی سے بات کی۔ انہیں ملتان میں ابھی کچھ اور دن لگنے تھے۔

ستارہ نے کھانا کھایا اور بعد میں پڑھنے کے لیے اپنی اسٹڈی ٹیبل بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک

پڑھتی رہی۔ اسے یونیورسٹی کا ڈین بننا تھا۔ جس کے لیے وہ بہت محنت کرتی تھی۔

رات کو سلیم بھائی گھر واپس آ گیا۔ وہ آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس کا موڈ سخت آف تھا۔ شاید سندس بھابھی سے کوئی لڑائی ہوئی تھی۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ ستارہ اسد بھائی کے کمرے میں آ گئی۔ بیڈ پر بیٹھی، رضائی لی، ٹی وی آن کیا اور ایک انگلش فلم دیکھنے لگی۔

فلم دیکھنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اپنے بازوؤں کا تکیہ بنایا۔ سر چھت کی طرف کیا۔ اسے پھر سے فردوس نظر آیا۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ مسکرانے لگی۔

"کیا فردوس بھی مجھے چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ کیا میں اسے اچھی لگتی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ جب فیملیز ایک دوسرے کو جانتی ہوں تو ٹینشن کس بات کی۔ یہ بات بھابھی اور عینی دونوں نے کی تھی۔"

ستارہ پھر سے فردوس کے خواب دیکھنے لگی۔ انسان جب کسی غلط کام کا ارادہ کرتا ہے تو دل اور دماغ دونوں اسے اشارہ دیتے ہیں کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ پر انسان خود کو تسلی دینے لگتا ہے کہ وہ صحیح کر رہا ہے۔

یہی حرکت ستارہ نے کی۔ اسے لگا وہ صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ وہ ساری رات فردوس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے نہیں لگتا فردوس خود سے بولے گا۔ عینی نے ٹھیک کہا تھا۔ شریف لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ جیسے آج کی فلم کی ہیروئن نے کیا تھا۔ سب کے سامنے اپنے ہیرو کو پرپوز کر دیا تھا۔ نہیں میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔ میں

کوئی فلم کی ہیروئن تھوڑی نہ ہوں پھر۔“
اس نے کروٹ بدلی، رضائی سے ہاتھ باہر نکال کر گھڑی پر ٹائم دیکھا۔رات کے تین بج رہے تھے۔نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔
”پھر میں کیا کروں۔ہاں ایک کام کرتی ہوں۔اسے خط لکھتی ہوں۔“ وہ ایک جھٹکے سے بیڈ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔”یہی ٹھیک رہے گا میں فردوس کو خط لکھوں گی۔“ زور سے تالی بجائی۔ تالی کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔دوبارہ سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔خوشی کے مارے اسے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔
اگلی صبح دیر سے اٹھی۔گھڑی پر ٹائم دیکھا، دس بج رہے تھے۔ وہ فوراً اٹھ کر واش روم بھاگی۔فریش ہوکر آئی۔گیلے تولیے کو دروازے پر ڈالا۔نیچے سے سندس بھابھی اور بھائی سلیم کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔یعنی سندس بھابھی واپس آگئی ہیں۔
ستارہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے بال ٹھیک کرنے لگی۔پستہ رنگ کی قمیص کے نیچے سفید رنگ کا ٹراؤزر پہنا۔بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اپنے آپ کو اوپر سے نیچے تک آئینہ میں دیکھا۔
رنگ سانولا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ہونٹوں کے اوپر ایک تل تھا۔بال لمبے اور کرلی تھے۔جسامت میں پتلی تھی، قد بھی اپنی عمر کے حساب سے مناسب تھا۔
”کیا میں اسے خط لکھوں؟ کیا میں خط لکھ کر اچھا کروں گی؟“
اپنی سوچوں میں مگن تھی جب سندس کی آواز پر چونکی۔
”ہم باہر جا رہے ہیں۔شام تک لوٹ آئیں گے۔“
”جی۔ٹھیک ہے۔“ اس نے بالوں کا برش میز پر رکھا۔

”تمہارے پیپرز کی تیری کیسی جا رہی ہے۔ساری رات تو فلم دیکھنے میں گزار دی تھی۔“ سلیم بھائی بھی پیچھے تھے۔

”آپ میرے پیپروں کی فکر مت کریں۔میرے بہت اچھے نمبر آئیں گے۔“ ستارہ کو ہمیشہ سے سلیم بھائی کی باتوں سے چڑ ہوتی تھی۔ان کی باتوں میں طنز ہوتا تھا۔

”دیکھ لیتے ہیں۔کتنے نمبر آتے ہیں۔“

ستارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔کچھ کہتی تو وہ رائی کا پہاڑ بناتا۔اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

وہ دونوں گھر سے چلے گئے۔ان کے جاتے ہی ستارہ نے ناشتہ کیا۔پورے گھر کی صفائی کی۔کچن کو اچھے سے صاف کیا۔اپنے لیے چنے کی دال کی کھچڑی بنائی۔

سارے کام کرتے تقریباً شام ہو گئی۔اپنی اسٹڈی ٹیبل پر دوبارہ پڑھنے بیٹھ گئی۔فزکس کے پرابلم حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔آج پھر سے پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تھا۔بار بار فردوس کا خیال ذہن میں آ رہا تھا۔

”مجھے اپنی پڑھائی پر فوکس کرنا چاہیے۔اگر نمبر کم آئے تو میرا ڈین بننے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔میں ایسے ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔پہلے میرا خواب بعد میں کوئی اور۔“

گھر کی بیل بجی۔ستارہ کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔گھڑی پر ٹائم دیکھا۔فردوس کے آنے کا وقت تھا۔اپنے سر پر دوپٹہ لیا۔زینے اتر کر گیٹ تک پہنچی۔اپنا حلیہ پھر سے ٹھیک کیا اور دروازہ کھولا۔

”کیسی ہو میڈم جی۔“

”تم۔۔اس وقت۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''میرا گھر ہے میں جب چاہے آؤں۔'' حسن بیگ لے کر اندر داخل ہوا۔

''امی ابو نہیں آئے۔وہ کب آئیں گے۔'' ستارہ نے گہری سانس لی۔اپنے آپ کو پرسکون کیا۔

''وہ ایک ہفتے تک آجائیں گے۔'' بیگ زمین پر رکھا۔کرسی پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔''اور تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی ہے۔'' گلے سے مفلر اتارا۔

''مطلب۔کیسی چھٹی۔'' ستارہ بھی پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ماتھے پر تیوری چڑھی۔

''مجھے فردوس نے کال کیا تھا موبائل پر۔'' اپنی جیکٹ سے موبائل نکال کر ستارہ کے سامنے کیا۔اس کے پاس موبائل تھا۔اس بات سے ہمیشہ اپنی بہن کو چھیڑتا تھا۔''میرے موبائل پر۔'' وہ اونچی آواز میں بولا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' ستارہ کا حلق خشک ہوا۔

''وہ کہہ رہا تھا۔وہ ایک ہفتے کے لیے پڑھانے نہیں آئے گا۔اسے کوئی ضروری کام ہے۔میں نے کہا جیسے تمہاری مرضی۔'' حسن نے اپنی جیکٹ اتاری اور واش روم میں گھس گیا۔ستارہ ادھر کرسی پر بیٹھی رہی۔نہ جانے کیوں اسے فردوس پر غصہ آنے لگا۔حسن واش روم میں کچھ کہہ رہا تھا۔وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔بجھے دل سے اپنے کمرے میں آگئی۔

''وہ ایک ہفتے بعد آئے گا۔اب میں کیا کروں گی۔''

دل میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔اس کا چہرہ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔وہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔جب حسن نے زور سے دروازہ ناک کیا۔

''کیا مجھے کھانا ملے گا، بہت بھوک لگ رہی ہے۔میں تم سے باتیں کر رہا تھا۔تم اوپر آگئی۔'' اپنے دونوں بازو کمر پر رکھے۔

''اچھا آرہی ہوں۔'' فوراً اپنے آنسو صاف کیے۔ اسے حسن پر بہت غصہ آرہا تھا۔ ''کیا ضرورت تھی اسے چھٹی دینے کی۔''

اس نے اپنے غصے پر قابو پایا اور نیچے آئی۔ کچن میں جا کر کھانا گرم کیا۔ اپنے بھائی کو کھانا دیا۔ حسن اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ دل تو کر رہا تھا کہ فردوس کا نمبر لے کر بہت سنائے۔

حسن کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ستارہ کا کھانا کھانے کو بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنی میز پر پڑھنے کے لیے دوبارہ بیٹھی۔

میتھ کی کتاب کے ساتھ اپنا رجسٹر کھولا۔ پین اٹھایا اور الجبرا کا سوال حل کرنے لگی۔ کتنی دیر ایک ہی سوال پر اڑی رہی۔ سوال حل ہی نہیں ہو رہا تھا۔ چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی۔

سر میں شدید درد ہونے لگا۔ آنکھوں میں سوجن ہونے لگی۔ تنگ آ کر رجسٹر زمین پر زور سے پٹخ دیا۔ باقی کتابیں بھی غصے میں میز سے نیچے پھینک دیں۔ پھر وہ اپنے کمرے سے باہر آئی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی۔ سندس بھابھی اور سلیم آج رات پھر گھر پر نہیں آئے۔ حسن بھی سو گیا تھا۔

ستارہ اپنے گھر کی بالکونی میں آ کر کھڑی ہوئی۔ بہت شدید ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ آسمان سیاہ تھا۔ اتنی سردی میں بھی اسے پسینہ آرہا تھا۔ دل اور دماغ پر فردوس کا بھوت سوار تھا۔ وہ کافی دیر تک کالے آسمان کو گھورتی رہی۔ جب سر درد اور بڑھ گیا تو اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ سر پر دوپٹہ باندھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

پورا ایک ہفتہ گزرا۔ اس کی حالت ایسی ہی رہی۔ ساری رات دعائیں مانگتی تھی۔ کئی بار خط لکھنے کی کوشش کی۔ جو دماغ میں آتا وہ خط پر لکھتی۔ پھر اس خط کو پھاڑ کر ڈسٹ بن میں

پھینک دیتی۔ وہ کبھی کبھی باتوں میں حسن سے فردوس کے بارے میں پوچھتی۔ دونوں ساتھ میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ حسن اپنی سپورٹس پریکٹس کے بارے میں بتاتا۔ جب فردوس کا ذکر آتا۔ وہ بہت شوق سے فردوس کے بارے میں سنتی۔

دسمبر کے مہینے کا آخری دن تھا۔ کل سے نیا سال شروع ہونا تھا۔ شام کے وقت ستارہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی شلوار کے ساتھ سفید رنگ کی قمیص پہنی تھی۔ گھٹنوں تک لال رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا۔ بالوں کی ہائی پونی بنائی ہوئی تھی۔

''ستارہ! ذرا نیچے آنا۔'' حسن کی آواز آئی۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام کی وجہ سے اسے تنگ کرتا رہتا تھا۔ اپنی کتاب بند کی، کرسی سے اپنا مفلر گلے میں ڈال کر نیچے آئی۔

آنٹی خدیجہ اور حاجی اکرام ملتان سے واپس آگئے تھے۔ سب ٹی وی ہال میں بیٹھے تھے۔ ستارہ اپنے امی اور بابا سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ حسن فوراً اس کی شکایتیں لگانے لگ گیا۔

''امی! دیکھ لیں گھر کتنا گندہ ہے۔ کچن سے کتنی بدبو آرہی ہے۔ وہ میز کے نیچے دیکھیں مٹی کی تہہ جمی ہے۔ صوفے کے پاس کل میں نے چوہا مارا تھا۔ ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ دیکھ لیں اپنی کام چور بیٹی کو۔''

وہ آنٹی خدیجہ کے پاس بیٹھ کر اپنی انگلیوں پر گنوا رہا تھا۔ ستارہ بھی اسے تنگ کرنے لگی۔ حسن کے موبائل پر کال آئی وہ گھر سے باہر چلا گیا۔ آنٹی خدیجہ ستارہ کو سامان دکھانے لگیں جو وہ ملتان سے لائی تھیں۔ ان میں سے کچھ گفٹ زینی آپی کے لیے تھے۔ حاجی اکرام تھکاوٹ کی وجہ سے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

''امی! دیکھیں کون آیا ہے۔'' حسن کے ساتھ فردوس اندر داخل ہوا۔ ''ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ ستارہ پلیز دو کپ چائے بنادو۔''

فردوس کا نام سنتے ہی ستارہ کے کان کھڑے ہو گئے۔فردوس آنٹی خدیجہ کو سلام کر رہا تھا۔ آج تو وہ زیادہ ہی خاص لگ رہا تھا۔کالے رنگ کی شلوار قمیض کے ساتھ کالے رنگ کی شال اوڑھی ہوئی تھی۔کالا رنگ اس پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔وہ کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

''اور سناؤ تمہاری امی کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' آنٹی خدیجہ اس سے اس کی امی کا حال پوچھنے لگیں۔

''اللہ کا شکر ہے اب بہت بہتر ہیں۔بس ذرا ٹھنڈ لگ گئی تھی۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''تم دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھو، میں چائے بھیجتی ہوں۔میں ذرا کچن بھی دیکھوں۔کیا حشر کیا ہے میرے کچن کا۔'' آنٹی خدیجہ کھانے کا سامان اٹھا کر کچن میں چلی گئیں۔

حسن، فردوس کو لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ستارہ کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ دل زور سے دھڑکا، چہرے پر مسکراہٹ آئی۔وہ واپس آ گیا۔''اس کی امی کی طبیعت خراب تھی اور میں بھی۔''

وہ آنٹی کی آواز پر کچن میں گھسی۔امی کے ساتھ مل کر چائے بنائی۔وہ ملتان سے سردیوں کے کچھ لوازمات لائی تھیں۔انہیں چائے کے ساتھ ڈش میں سجایا۔

''جا۔جا کر چائے حسن اور فردوس کو دے آ۔تب تک میں تمہارے ابو کو چائے دے آؤں۔بعد میں کچن کی صفائی کرتی ہوں۔ایسا لگتا ہے جیسے سالوں سے کچن بند پڑا ہو۔اتنا گندا کچن۔''

گندا کچن دیکھ کر ان کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا تھا۔آنٹی خدیجہ صفائی کے معاملے میں بہت سخت تھیں۔

آنٹی خدیجہ چائے لے کر اپنے شوہر کے کمرے میں چلی گئیں۔امی کا موڈ فل آف ہو گیا تھا۔پر ستارہ کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بالوں کی ایک لٹ نکالی۔چہرے سے مسکراہٹ جا ہی نہیں رہی تھی۔چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں جانے لگی۔عین موقع پر بھائی اور بھابھی واپس آ گئے۔سلیم بھائی نے ستارہ اور پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھے دونوں فرد کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھا۔وہ دونوں میاں بیوی اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''لو چائے آ گئی۔لگتا ہے امی نے بنائی ہے۔تبھی اتنی خوشبو آ رہی ہے۔'' حسن اور فردوس یقیناً کرکٹ میچ کی باتوں میں مصروف تھے۔ستارہ نے ڈش میز پر رکھی۔پیروں کے بل بیٹھ گئی۔آج اسے حسن کی بات پر ذرا غصہ نہیں تھا۔ورنہ دونوں بہن بھائی کا لڑے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تھا۔

''ہم دونوں کی چائے پھیکی رکھنا۔اب سے ہم ڈائٹنگ پر ہیں۔'' حسن چائے کی خوشبو سونگھتے بولا۔

''اور یہ ملتانی حلوہ۔ڈائٹنگ میں کھاؤ گے۔'' ستارہ نے چائے کے کپ ان کے سامنے رکھ دیے۔

''ہاں میں ذرا سا چکھوں گا۔'' فردوس نے چائے کا سپ لیا۔''یہ تم کیا سا تنا کلا زنی ہوئی ہو۔یہ بتاؤ تمہارے پیپروں کی تیاری کیسے جا رہی ہے؟''

''بس۔اچھی۔'' اچانک پوچھے جانے والے سوال پر ستارہ گھبرا گئی۔اسے امید نہیں تھی۔فردوس اس سے یوں بات کرے گا۔

''میڈم جی نے بڑے ہو کر یونیورسٹی کا ڈین بننا ہے۔'' ملتانی حلوہ کھاتے ہوئے حسن فوراً بیچ میں کودا۔

"تم نے ڈائننگ کرنی تھی۔" ستارہ نے اسے یاد دلایا اور کمرے سے نکل آئی۔ آنٹی خدیجہ کچن کی صفائی کر رہی تھیں۔ وہ شدید غصے میں تھیں۔ ستارہ نے ٹی وی ہال سے کپڑوں کے بیگ اٹھائے۔ گندے کپڑے واشنگ مشین میں رکھے۔ صاف کپڑے واپس الماری میں رکھ دیے۔ ذینی آپی کے گفٹس ایک طرف کر دیے۔

"امی! صفائی صبح کر لینا۔ سندس کے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ آپ بھی آرام کر لیں۔ ابھی تھکی ہوئی آئی ہیں۔"

"کیا تمہاری بیگم کو اس کی ماں نے صفائی کرنا نہیں سکھایا۔ اتنا گندا گھر، اتنا گندا کچن۔" فریج کا دروازہ زور سے بند کیا۔

"آپ میری ماں کو بیچ میں مت لائیں۔ اپنی بیٹی کو بول دیتیں وہ گھر اور کچن کی صاف کر دیتی۔" سندس فٹ سے بولی۔

فردوس اپنے گھر چلا گیا۔ حسن فردوس کو گیٹ پر چھوڑ کر واپس آیا۔ ڈرائنگ روم سے برتن لا کر کچن میں رکھ دیے۔ ستارہ نے سکھ کا سانس لیا فردوس نے کچھ نہیں سنا۔

"تم دونوں اپنے روم میں جاؤ۔ میرا پہلے بہت دماغ خراب ہو رہا ہے۔ تمہیں بھی پوری دنیا میں یہی لڑکی ملی تھی۔ نہ گھر سنبھالنا آتا ہے نہ کوئی کام کرنا آتا ہے۔ بس سارا دن گھوم پھر لو۔"

سندس بھابھی جواب دینے کے لیے آگے بڑھی۔ حاجی اکرام اپنے کمرے سے باہر آئے۔ انہوں نے سب کو اپنے اپنے کمرے میں بھیج دیا۔ آنٹی خدیجہ بھی خاموش ہو گئیں۔

ستارہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنا مفلر اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ "شکر ہے فردوس نے کچھ نہیں سنا۔ نہ جانے ہمارے بارے میں کیا سوچتا۔ ویسے فردوس نے کیا کہا تھا سانتا کلاز ہوں۔"

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا۔ ریڈ اینڈ وائٹ سا نیتا کلاز۔

''اس کی نظر واقعی تیز ہے۔ ایک منٹ میں دیکھ لیا۔ میں نے کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں۔'' گہری سانس لی۔ بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ ''مجھے آج اپنے اوپر پیار آ رہا ہے۔ ایک کام کرتی ہوں۔ اسے خط لکھ ہی دیتی ہوں۔ امی بھی کتنی خوش ہو کر اس سے ملی تھیں۔''

گھر کے سب لوگ سو چکے تھے۔ اپنے کمرے کا دروازہ لاک کیا۔ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی، پین اٹھایا اور ایک خط لکھا۔ اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا۔

اپنی الماری سے پرفیوم نکال کر اس پر چھڑکا۔ خط کو بڑی احتیاط سے فولڈ کر کے بیالوجی کی بک میں رکھ دیا۔

''کل شادی پر جانے سے پہلے میں یہ خط فردوس کو دے دوں گی۔ ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔''

اب تو پڑھنے کو بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ دل تو کہیں اور جگہ مصروف تھا۔ اپنی الماری سے شادی پر جانے کے لیے کپڑے نکالے۔ لمبی ہیل والی سینڈل، اپنی جیولری، ہینڈ بیگ اور میک اپ کا سامان تیار کر لیا۔

نیند آج پھر نہیں آ رہی تھی۔ کالے رنگ کی شلوار قمیض پہنی، فردوس اس کی نظروں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ بستر پر لیٹ کر آنکھوں میں خواب لیے، چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ کل کی پلاننگ کر رہی تھی۔

اس بات سے بالکل انجان نیچے بھابھی فل غصے میں تھیں۔ سب کے سامنے آنٹی خدیجہ نے اس کی بے عزتی کی تھی۔

''تمہاری بہن نے شکایت لگائی ہو گی کہ میں روز گھومنے جاتی ہوں۔ کیا وہ گھر کا کوئی کام نہیں کر سکتی۔'' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے چہرے پر ماسک لگایا۔

"میں صبح امی سے بات کروں گا۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔ ریموٹ سے چینل چینج کیا۔ "تم اپنا بی پی مت ہائی کرو۔"

"اور میاں جی تم مزے سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھو۔ میں اپنی انسلٹ کا بدلہ لے کر رہوں گی۔ اگر گھر کی صفائی کی اتنی فکر ہے تو ایک کام والی لگوا لیں۔ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔" کریم اپنے ہاتھوں پر لگا کر دراز زور سے بند کی۔ "اب دیکھنا میں کل کیا کرتی ہوں۔"

دسمبر کا مہینہ تھا۔ اور یہ سال کا آخری دن تھا۔ کوئی مزے سے خواب دیکھ رہا تھا۔ کسی کے دماغ میں سازش چل رہی تھی۔ کسی کو مستقبل کی فکر تھی۔

آج سال کا پہلا دن تھا۔ اس گھر کی صبح معمول کے مطابق تھی۔ ہر کوئی اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ آنٹی خدیجہ گھر کی صفائیوں میں لگی ہوئی تھیں۔ سندس اپنے کمرے میں منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ حاجی اکرام اور حسن اپنی دکان پر تھے۔

شام کو ستارہ نے زینی آپی کی شادی پر جانا تھا۔ اگلے ہفتے سے سکول کھلنے تھے۔ سکول کے کھلتے ہی سکول میں ٹیسٹ شروع ہونے تھے۔ جس کی وجہ سے پڑھائی کا بر ڈن بڑھ گیا تھا۔

"تم ابھی تک پڑھ رہی ہو۔ شادی پر نہیں جانا۔ عینی نے تم سے کہا تھا جلدی آجانا۔" آنٹی خدیجہ نے دھوئے ہوئے کپڑے بیڈ پر رکھے۔ "تم نے پہلے زینی کے ساتھ پارلر جانا ہے۔"

"امی! ابھی دوپہر ہے۔ شادی تو شام کو ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"بے وقوف لڑکی، دلہن کو تیار ہونے میں ٹائم تو لگے گا۔ ابھی جائے گی تو شام تک تیار ہوئے گی۔ اور ویسے بھی مولوی صاحب کی فیملی ٹائم کے بہت پابند ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔" ان کے ہاتھ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کپڑے تہہ کر کے الماری میں لگا رہی تھیں۔

ستارہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ٹائم واقعی بہت ہو گیا تھا۔

''اچھا میں پہلے نہا لیتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں وقت پر پارلر پہنچ جاؤں گی۔''

''تم ایسا کرنا خود بھی پارلر سے تیار ہو جانا۔'' آنٹی خدیجہ نے اس کے شادی کے کپڑے اور دوسرا سامان بیگ میں ڈال دیا۔

وہ اپنا تولیہ لے کر واش روم میں گھس گئی۔ وہ جلدی سے نہا کر فارغ ہوئی۔ زینی اسے لینے آ گئی تھی۔ اپنے سر پر شال اوڑھی، اپنا بیگ لیا اور زینی کے ساتھ چلی گئی۔

آنٹی ہاجرہ کی فیملی اتنی امیر نہیں تھی مگر پھر بھی انہوں نے اپنے گھر کو تھوڑی بہت لائٹس سے سجایا ہوا تھا۔ شادی کا چھوٹا سا فنکشن تھا جو محلے ہی میں رکھا تھا۔

آنٹی خدیجہ کی ذمہ داری تھی۔ دلہن کو پارلر سے گھر لانے کی۔ زینی آپی دلہن بن کر بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''آپی! آپ تو سچ میں شہزادی لگ رہی ہیں۔ کہیں دانش بھائی آپ کو دیکھ کر بیہوش نہ ہو جائیں۔'' ستارہ نے انہیں چھیڑا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ ابھی صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔'' انہوں نے اسے ڈانٹا۔

''باہر آپ دونوں کو لینے آئے ہیں۔'' پارلر والی لڑکی نے انہیں بتایا۔

ستارہ نے فٹ سے اپنا سارا سامان سمیٹا اور زینی آپی کو لے کر پارلر سے باہر آ ئی۔ شام ہو چکی تھی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے حسن کے ساتھ فردوس کو دیکھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھولا، پہلے زینی آپی کو گاڑی میں بٹھایا۔ بعد میں خود گاڑی میں بیٹھی۔ حسن نے سامان پیچھے رکھ دیا۔ ستارہ کی نظریں فردوس پر تھیں مگر اس نے ایک بار بھی اس کی

طرف نہیں دیکھا۔

زینی آپی کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد ستارہ اپنے گھر آ گئی۔ پارلر میں بہت رش تھا جس کی وجہ سے وہ پارلر میں تیار نہیں ہو سکی۔ وہ آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

''کل تو اس کا موڈ بڑا اچھا تھا۔ آج کیا ہو گیا ہے۔ ایک تو پارلر میں آج کے دن ہی رش ہونا تھا۔''

اپنے کپڑے تبدیل کیے۔ گولڈن رنگ کے ٹراؤزر کے اوپر پنک کلر کی شرٹ زیبِ تن کی۔ شرٹ پر موتی کا کام ہوا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ دوپٹہ گلے میں ڈالا۔ آنکھوں میں مسکارا لگایا، ہلکی سی لال رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ کانوں میں جھمکے پہنے۔ دونوں ہاتھوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں پہنیں۔ پیروں میں ہائی ہیل پہنی۔

الماری سے زینی آپی کے لیے گفٹ نکالا جو ملتان سے اس کی امی لائی تھیں۔ اسے گفٹ بیگ میں ڈالا اور اپنے ساتھ ٹک ٹک کرتی نیچے لائی۔

''امی! چلیں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اس وقت آپ کچن میں کیا کر رہی ہیں۔'' ستارہ اپنے ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی پہن رہی تھی۔ ''یہ کس کے لیے چائے بنا رہی ہیں۔'' بالوں کو اپنے کان کے پیچھے کیا۔

''آج پڑھنا نہیں ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' فردوس ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ستارہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ کل والے لباس میں تھا۔ اس کا دھیان موبائل کی طرف تھا۔

''یار! آج اس کی چھٹی ہے۔ میڈم جی شادی پر جا رہی ہیں۔'' حسن کچن سے ملتانی حلوہ لے کر نکلا۔

''ہاں۔چلو چلتے ہیں۔میں ان دونوں کے لیے چائے بنا رہی تھی۔میں ذرا کمرے سے اپنا پرس پکڑ لوں۔'' آنٹی خدیجہ نے اپنے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں گئیں۔

ستارہ کچن کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔اس کے دل کی دھڑکن پھر سے تیز ہو گئی۔

حسن چائے کی ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں گیا۔پھر نہ جانے کس کام سے گھر سے باہر نکلا۔

موقع اچھا تھا آس پاس کوئی موجود نہ تھا۔فردوس ڈرائنگ روم میں اکیلا تھا۔وہ الٹے قدم اوپر کو بھاگی۔اپنے بیڈ کے سرہانے کے نیچے سے خط نکالا۔

''کیا میں اسے دے دوں۔وہ کیا سوچے گا؟''

دل میں خوف پیدا ہوا۔ہاتھ بھی کانپنے لگا۔چند لمحوں میں فیصلہ کیا۔''خط دے دیتی ہوں۔'' اپنے سر کو خم دیا۔خط کو لے کر نیچے آئی۔

ابھی تک میدان صاف تھا۔دھیرے سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں جھانکا۔وہ بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا۔فردوس صوفے پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ایک ہاتھ میں موبائل تھا۔دوسرے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔چائے کے کپ سے بھاپ اڑ رہی تھی۔دھڑکتے دل سے اندر کمرے میں قدم رکھا۔ہائی ہیل سے ایک آہٹ پیدا ہوئی۔فردوس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا۔دونوں کی نظریں ملیں۔ستارہ ہمت کر کے تین چار قدم چلی۔

''یہ۔یہ۔تمہارے۔آپ۔۔کے لیے۔'' سیدھے ہاتھ میں پکڑا خط آگے کیا۔

فردوس سیدھا ہو کر بیٹھا۔چائے کا کپ میز پر رکھا۔اپنی آنکھیں سکیڑیں۔اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا۔ستارہ وہ خط اس کی گود میں پھینک کر واپس بھاگی۔اس ہی وقت آنٹی خدیجہ اپنے کمرے سے باہر آئیں۔

''چلو چلتے ہیں۔کہیں مزید دیر نہ ہو جائے۔'' اپنی شال کو پھیلا کر لیا۔

”جی۔“ ستارہ کی سانسیں اوپر نیچے ہوگئیں۔اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

دونوں ماں بیٹی گھر سے نکلیں۔ ستارہ نے جاتے ہوئے ایک نظر فردوس پر ڈالی۔وہ خط پڑھ رہا تھا۔وہ نہیں سمجھ پائی وہ محض ایک خط نہیں دے کر آئی۔ بلکہ اپنی بربادی لکھ کردے آئی ہے۔

”آئیں میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“ حسن گیٹ پر کھڑا تھا۔ان کے ساتھ گیا۔گھر تک چھوڑ کر واپس آ گیا۔

ستارہ کا دھیان پیچھے ہی تھا۔اس کے دل اور دماغ میں الگ الگ خیالات چل رہے تھے۔جب شادی پر بینڈ بج رہا تھا۔اس کا بھی دل کر رہا تھا کہ وہ خوشی سے بھنگڑا ڈالے۔

شادی بالکل سادگی سے ہوئی۔عینی مہمانوں کے ساتھ مصروف تھی۔ ستارہ کو گھر جانے کی جلدی تھی۔اپنی ماں کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر وہ رنگ برنگی لائٹس کو دیکھ رہی تھی۔اس کے دل کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

”اب تک اس نے میرا خط پڑھ لیا ہوگا۔نہ جانے وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا۔“

☆......☆......☆

بارات بالکل ٹائم پر آئی۔مولوی صاحب کے گھر سے چند لوگ آئے تھے۔نکاح مولوی صاحب نے خود پڑھایا۔نکاح کے فوراً بعد رخصتی ہوگئی۔آنٹی ہاجرہ اور عینی دونوں خوش بھی تھے اور اداس بھی۔اس بات میں کوئی شک نہیں تھا۔آنٹی ہاجرہ نے اپنے بچوں کو بہت محنت سے پالا تھا۔اللہ نے ان کا ایک فرض ادا کر دیا تھا۔

سب مہمانوں کے جانے کے بعد ستارہ بھی اپنی ماں کے ساتھ گھر آئی۔اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی اسے پسینہ آ رہا تھا۔گھر پر قدم رکھتے ہی اس کی نظریں ڈرائنگ روم کی طرف گئیں۔لائٹ آف تھی یعنی وہ جا چکا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔وہ اپنے کمرے میں آئی۔ہیل اتاری، بیڈ پر بیٹھ گئی۔اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتارتے ہوئے وہ گانا گنگنانے لگی۔اپنے خیالوں میں مگن وہ فردوس کو شیروانی پہنے دلہے کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

گھر کی گھنٹی بجی۔ستارہ کو جیسے کرنٹ لگا۔فردوس۔وہ بھاگتی ہوئی بالکوانی میں گئی۔اوپر سے نیچے جھانکا۔آنٹی آئی تھیں۔ستارہ اپنا بیگ وہیں بھول آئی تھی۔حسن نے ان سے بیگ لیا۔وہ ٹوٹے دل سے واپس اپنے کمرے میں آئی۔اپنی جیولری اتاری اور کپڑے تبدیل کیے۔

''فردوس کل پڑھانے آئے گا۔مجھے اب کل تک کا انتظار کرنا ہوگا۔پہلی بار پتہ چلا ہے کہ انتظار کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ابھی جا کر ابو سے ملتی ہوں۔کل جب وہ آئے تھے تو جلدی سو گئے تھے۔'' آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال باندھے۔

اپنی چیزیں سمیٹ کر نیچے آئی۔آنٹی خدیجہ حاجی اکرام کو ٹی وی ہال میں کھانا دے رہی تھیں۔وہ تخت پوش پر بیٹھے تھے۔حسن بھی پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔وہ شادی سے آیا ہوا کھانا کھا رہا تھا۔ستارہ بھی ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آ گئی میڈم آپ کی بھول بھلکڑ بیٹی۔اپنا پرس وہیں بھول آئی تھی۔'' اس نے چکن پیس اپنے منہ میں ڈالا۔

''تمہارا دھیان کدھر تھا۔بھلا ہو بہن ہاجرہ کا۔اس ہی وقت پرس واپس کر گئیں۔اگر پرس گم ہو جاتا تو۔'' آنٹی خدیجہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئیں۔گرم سالن میز پر رکھا۔

''بابا! یہ جان کر پرس ادھر بھول آئی تھی تاکہ آنٹی کھانا بھی دے جائیں۔'' حسن نے پھر کہا۔''اور فرض کرو اگر پرس چوری ہو جاتا تو۔''

''تمہاری تو ڈائٹنگ چل رہی تھی ناں۔'' گلاس میں پانی ڈالا۔''وزن دیکھو کہاں جا رہا

ہے۔ اتنے موٹے انسان کو کون ٹیم میں سلیکٹ کرے گا۔"

"ستارہ اب تم مت شروع ہو جانا۔ یہ بتاؤ پیپروں کی تیاری کیسی چل رہی ہے۔" حاجی اکرام نے دونوں کو ٹوک دیا۔

"تیاری اچھی جا رہی ہے۔ مجھے بس یونیورسٹی کا ڈین بننا ہے۔ اس لیے پوری کوشش کر رہی ہوں کہ نمبر اچھے آئیں۔ اگلے ہفتے سے سکول بھی کھل رہے ہیں۔" ستارہ ایک سانس میں بولی۔

ابھی اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ گھر کا گیٹ ایک دھماکے سے کھلا۔ سلیم بھائی اور سندس بھابھی اندر داخل ہوئے۔

"آرام سے گیٹ نہیں کھول سکتے۔" آنٹی خدیجہ غصہ ہوئیں۔

"اب اس چیز کا الزام بھی مجھ پر لگا دیں۔" سندس نے بلند آواز میں طنزاً جواب دیا۔ "جیسی ماں ویسی بیٹی یہی کہا تھا نا مجھ سے۔"

سندس بھابھی کے چہرے پر فاتحانہ خوشی تھی۔ اپنے دونوں بازو پیٹ پر باندھ کر سیدھی اپنی ساس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ سلیم کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ اس کے کالر کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے کسی سے لڑ کر آیا ہو۔

"کیا ہوا ہے؟" حاجی اکرام نے کھانا چھوڑ دیا۔ وہ سلیم کو دیکھ رہے تھے۔

"اپنی نیک، لاڈلی اور پڑھاکو بیٹی سے پوچھیں۔" سندس اپنے دونوں ہاتھ ستارہ کی طرف کر کے بدتمیزی سے بولی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ اپنی زبان کو لگام دو۔" خدیجہ آنٹی کے اندر کی ساس بولی۔ "اپنی آواز آہستہ رکھو۔ کیا تمہارے ماں نے تمہیں تمیز۔۔۔"

”میری ماں نے مجھے تمیز سکھائی ہے۔لگتا ہے آپ اپنی بیٹی کو تمیز سکھانا بھول گئی ہیں۔“ اپنا ایک ہاتھ اٹھایا۔حاجی اکرام، حسن، ستارہ سب خاموش تھے۔اچانک ہوئے اس حملے سے سب حیران تھے۔

”سلیم۔“

”امی! آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں یہ کیا کرتی پھر رہی ہے۔“ سلیم زور سے چلایا پھر ستارہ کی طرف متوجہ ہوا۔”یہ فردوس اور تمہارا کب سے چکر چل رہا ہے۔“ سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔

گھر میں ایک بم پھوٹا تھا۔ستارہ کا حلق خشک ہو گیا۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔وہ تو ادھر ہی بت بن گئی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ حاجی اکرام گرج کے بولے۔”فردوس۔“

”اپنی بیٹی سے پوچھیں۔“ سندس پھر چیخی۔”مجھے پہلے ہی اس کی حرکتوں پر شک تھا۔اگر پہلے کچھ کہتی تو سب مجھے ہی برا کہتے۔آپ کی لاڈلی بیٹی کیا گل کھلا رہی ہے۔اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں۔“ سلیم کے ہاتھ سے خط چھین کر آنٹی خدیجہ کے سامنے کیا۔

حاجی اکرام نے وہ خط پکڑا۔آنٹی خدیجہ ستارہ کو ایسے دیکھ رہی تھیں۔جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔حسن کھانا چھوڑ کر خط پڑھنے لگا۔گھر میں سناٹا چھا گیا۔صرف گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سلیم دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر کھڑا تھا۔سندس بھابھی کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ستارہ کو ایسے لگ رہا تھا۔جیسے اس کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔

”اس کو کہتے ہیں اپنا منہ اپنی چپیڑ۔دیکھا اللہ نے کیسے میرا ساتھ دیا۔کل تک مجھ پر کیچڑ

اچھال رہی تھیں۔میری ماں کو باتیں کر رہی تھیں۔آج اپنی نیک بیٹی کی کرتوت سامنے آ گئے۔"

"وہ تو شکر ہے فردوس خود سامنے سے یہ خط مجھے دے گیا۔ورنہ ہمیں کیا پتا یہ کہاں کہاں ہمارا منہ کالا کرواتی۔"

ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز پورے گھر میں گونجی۔آج زندگی میں پہلی بار حاجی اکرام نے اپنی بیٹی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔تھپڑ اتنے زور کا تھا ستارہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور کرسی سمیت نیچے گر گئی۔حاجی اکرام وہ خط زمین پر پھینک کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

آنٹی خدیجہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔وہ اپنے پیر کی چپل سے ستارہ کو ادھر ہی پیٹنے لگیں۔حسن پیچھے ہو گیا۔اس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔اس کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔

سندس نے اپنی باتوں سے خوب آگ لگائی۔سلیم کا پارہ فل چڑھا ہوا تھا۔وہ تو پہلے ہی سے شکی مزاج انسان تھا۔آنٹی خدیجہ جب تھک گئیں ادھر تخت پوش پر بیٹھ کر رونے لگیں۔سندس اور سلیم اپنے کمرے میں چلے گئے۔حسن نے وہ خط زمین سے اٹھایا۔

"وہ میرا بہت پرانا دوست تھا۔اب میں اس سے کیسے ملوں گا۔وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا۔"اس کے لہجے میں طنز اور نفرت تھی۔کرسی کو زور سے پیر مار کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آنٹی خدیجہ نے میز سے برتن اٹھائے۔کچن میں جا کر شیلف پر پٹخے وہ بھی اندر کمرے میں چلی گئیں۔ستارہ ادھر زمین پر تقریباً بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔

جب ہوش آیا تو سب جا چکے تھے۔وہ ہمت کر کے اٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔کمرے کا دروازہ بند کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔اپنے منہ پر تکیہ رکھ کر رونے لگی۔دل میں

ایک ہی خیال آ رہا تھا۔کاش میں وہ خط نہ لکھتی۔

''میری وجہ سے ابو اور امی کو کتنی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔فردوس کو کیا ضرورت تھی وہ خط بھائی کو دینے کی۔''

وہ ساری رات روتی رہی۔آج پہلی بار بابا نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔اللہ نے واقعی نیند میں سکون رکھا ہے۔نہ جانے کب نیند آئی اور وہ سو گئی۔

جب صبح آنکھ کھلی تو گھر میں شور ہو رہا تھا۔سلیم زور زور سے چلا رہا تھا۔سندس بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔اس کو موقع چاہیے تھا وہ اسے مل گیا تھا۔

ستارہ اپنے بیڈ سے ہمت کر کے اٹھی۔اس کے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ہمت کر کے اٹھی اور واش روم گئی۔واش روم سے واپس اپنے روم میں آئی۔وہ دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔سلیم اس کی اسٹڈی ٹیبل کے پاس کھڑا اس کی کتابیں کھول کھول کر زمین پر پھینک رہا تھا۔سندس اس کے کپڑوں کی الماری کی چھان بین کر رہی تھی۔

''باقی خط اور کارڈ کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔'' سلیم نے اس کے سکول کا بیگ خالی کر کے دور پھینکا۔

''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' ستارہ مری آواز میں بولی۔

''میڈم سامنے سے خود تھوڑی نہ بولیں۔ویسے اس خط سے خوشبو آ رہی تھی۔کیا یہ پرفیوم چھڑکا تھا۔'' سندس نے اس کی الماری سے پرفیوم کی بوتل نکالی۔اس پرفیوم کو چھڑکا۔پرفیوم کی خوشبو پورے کمرے میں پھیل گئی۔

سلیم نے اس کی اسٹڈی ٹیبل کے سامنے سے چٹیں کھینچ کر اتاریں۔انہیں اپنے ہاتھ میں مڑوڑ کر زمین پر پھینک دیا۔ان چٹوں پر اس نے اپنے خواب لکھے تھے۔وہ اس کی نظر کے

سامنے چکنا چور ہو گئے۔

"میں دیکھتا ہوں تم کیسے سکول جاتی ہو۔آج سے تیرا پڑھنا لکھنا بند، سمجھی۔" سلیم اپنی شہادت کی انگلی سے وارننگ دے کر کمرے سے نکل گیا۔

ستارہ کی نظریں ان چٹوں پر جمی تھیں۔جن کے ٹکڑے پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔وہ ادھر زمین پر بیٹھی ان کاغذ کے ٹکڑوں کو جمع کرنے لگی۔

"یہ میرے خواب ہیں۔میں اپنے خوابوں کو ضرور پورا کروں گی۔" اپنی ساری کتابیں سمیٹ کر واپس میز پر رکھیں۔اس پرفیوم کی خوشبو سے سر میں درد ہونے لگا۔

"بابا اور ماما سے معافی مانگ لیتی ہوں۔بابا مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔" اپنے آنسو صاف کیے۔کرسی پر بیٹھ کر ان چٹوں کو آپس میں جوڑنے لگی۔

مصیبت بتا کر تھوڑی نہ آتی ہے۔گھر کی بیل زوروں سے بجی۔گیٹ کھلا،حسن کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ستارہ ان چٹوں کو چھوڑ کر نیچے کو بھاگی۔وہ سیڑھیوں کے آخری زینے پر کھڑی تھی۔حاجی اکرام کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا وہ ہسپتال میں تھے۔

آنٹی خدیجہ روتی ہوئیں اپنی چادر لے کر حسن کے ساتھ چلی گئیں۔وہ بھی ساتھ جانا چاہتی تھی۔پر سلیم نے اسے ادھر ہی روک دیا۔وہ اسے گالیاں بکتا ہوا سندس کے ساتھ ہسپتال کے لیے نکل گیا۔

وہ گھر پر تنہا رہ گئی۔اس کے پاس فون نہیں تھا۔اپنے باپ کی خیریت ہی دریافت کر لیتی۔رونے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔گھر کی پھر بیل بجی۔دوڑ کر گیٹ کھولا۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" عینی اندر داخل ہوئی۔"انکل کو کیا ہوا ہے؟"

"ایکسیڈنٹ۔مجھے صرف اتنا پتا ہے۔" وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔

"پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے لے کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میرے پاس موبائل ہے تم نمبر بولو۔"

"ابھی لاتیں ہوں ڈائری پر لکھا ہے۔" اندر کمرے سے ڈائری لے کر آئی۔ "یہ بابا کا نمبر ہے اس نمبر پر کال کرو۔"

عینی نے وہ نمبر اپنے موبائل پر ملایا۔ رنگ جاری تھی کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ حسن کو بھی کال ملائی وہ بھی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

"کوئی نہیں اٹھا رہا۔ سلیم بھائی کا نمبر دو۔ انہیں کال کرتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔ انہیں کال مت کرنا۔"

عینی کے پوچھنے پر ستارہ نے اسے ساری بات بتادی۔ کس طرح وہ سندس بھابھی کی باتوں میں آگئی اور یہ بھی بتایا سلیم بھائی نے اسے دھمکی دی ہے کہ وہ اب سکول نہیں جائے گی۔

"تجھے کیا ضرورت تھی فردوس کو خط لکھنے کی۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم ایسا کرسکتی ہو۔ انکل نے تجھ پر ہاتھ اٹھایا اور وہ کیا کرتے۔ تمہارے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے، تمہارا رشتہ لے کر جاتے۔"

"عینی! اب میں کیا کروں۔ کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کر رہا۔ اگر بابا کو کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔" پھر سے زاروقطار رونے لگی۔

"ابھی تم صرف اللہ سے دعا مانگو۔ تمہاری بھابھی اس بات کا پورا فائدہ اٹھائیں گی۔ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے کر رہیں گی۔ اور تمہارا بھائی وہ تو اپنی بیگم کے اشاروں پر چلے گا۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا جو ہو گیا ہے۔" اس نے دوپٹہ سے اپنے آنسو کیے۔ حسن کو دوبارہ کال ملائی۔ اس بار اس نے فون اٹھا لیا۔ حاجی اکرام کا

معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر کافی بڑھ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آئی سی یو میں تھے۔

عینی کو زینی آپی کی طرف جانا تھا۔ اس لیے وہ اپنے گھر چلی گئی۔ شام کو گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ آنٹی خدیجہ حسن کے ساتھ گھر آئیں۔

''بابا کیسے ہیں؟ اب ان کی طبیعت کیسی ہے۔'' ستارہ ادھر صحن میں بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنا برا حال کیا ہوا تھا۔ آنٹی خدیجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پریشان وہ بھی بہت تھیں۔ وہ آتے ہی کچن میں چلی گئیں۔ حسن فریش ہونے چلا گیا۔

''مجھے صرف اتنا بتا دیں بابا کیسے ہیں۔ مجھے بھی ان سے ملنے جانا ہے؟'' کل رات سے بھوکی تھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''ٹھیک ہیں۔'' وہ ان کے لیے یخنی تیار کر رہی تھیں۔ ''میں حسن کے ساتھ ہسپتال جا رہی ہوں۔ آج رات ادھر رہوں گی۔ سندس ابھی واپس آجائے گی۔'' اس کی طرف دیکھے بغیر بولیں۔

''میں نے بھی ہسپتال جانا ہے۔'' روتے ہوئے بولی۔

''امی! چلیں ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔'' حسن کپڑے بدل کر آ گیا۔ وہ دونوں ہسپتال کے لیے پھر نکل گئے۔ ستارہ نے ساتھ چلنے کی بہت ضد کی۔ وہ اسے روتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ رات کو سندس اور سلیم گھر واپس آ گئے۔ ستارہ نے ان سے کوئی بات نہ کی۔

تین دن بعد حاجی اکرام گھر واپس آ گئے۔ ہسپتال میں انہیں فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ستارہ کی ہمت نہ ہوئی ان سے سامنا کرنے کی۔ ان کی حالت کا ذمہ دار وہ خود کو ٹھہرا رہی تھی۔ حسن اپنے کرکٹ میچ کے سلسلے میں دوسرے شہر چلا

گیا تھا۔کل سے سکول کھلنے تھے۔ستارہ سکول جانے کی تیاری کر رہی تھی۔جب سے یہ واقعہ ہوا تھا۔وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔اس رات وہ اپنے سکول کا یونیفارم پریس کر رہی تھی۔جب آنٹی خدیجہ اس کے پاس آئیں۔

”کل سے تم سکول نہیں جاؤ گی۔“استری کا سوئچ بند کیا۔”اپنا منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو۔“

ستارہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔اپنے یونیفارم کو اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دبوچ لیا۔

”سلیم نے تمہارا رشتہ اپنے سالے کے ساتھ طے کر دیا ہے۔“وہ ایسے بول رہی تھیں۔جیسے وہ بے حس ہوں۔ان کا دھیان کہیں اور ہو اور وہ کچھ اور کہہ رہی ہوں۔

”امی۔آپ۔“ستارہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

”جو کہا ہے وہ کرو۔“ستارہ کو ایسے دیکھا جیسے آخری بار دیکھ رہی ہوں۔

”میں آپ سے کتنی بار معافی مانگ چکی ہوں۔ایک چھوٹی سی خطا ہو گئی تھی۔“پھٹی ہوئی آنکھوں سے بولی۔

”جو کہا ہے وہ کرو۔“اس کے سر پر پیار دینے لگیں۔پھر ہاتھ وہیں روک لیا۔لمبے لمبے ڈگ لیے وہ وہاں سے چلی گئیں۔

”میں بابا سے بات کرتی ہوں۔ایسے کیسے میرا رشتہ طے کر دیا۔“وہ نیچے اپنے بابا کے کمرے میں آئی۔وہ دوا کھا کر سو رہے تھے۔

ڈرائنگ روم میں مہمان آئے ہوئے تھے۔سلیم کھانے کا سارا سامان بیکری سے لایا تھا۔آج وہ بہت خوش تھا۔اپنے بابا کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ دبے پاؤں کمرے سے

باہر آئی۔

وہ اوپر جانے لگی تو سندس زبردستی اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ڈرائنگ روم میں سندس کے ماں باپ کے علاوہ اس کا بھائی بھی بیٹھا ہوا تھا۔جس کے ساتھ ستارہ کا رشتہ طے کر دیا تھا۔وہ بہت ہی عجیب تھا۔

سندس کی ماں نگینہ رانا نے ستارہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ستارہ نے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔جو سر جھکائے بیٹھیں تھیں۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔آخر ایسا کیا ہوا ہے جو اس کا رشتہ راتوں رات طے کر دیا ہے۔دوسرا کیا بابا اور اسد بھائی کو اس بارے میں کچھ پتا ہے۔اور سب سے بڑھ کر امی سندس اور اس کے گھر والوں کے سخت خلاف تھیں۔تو اب وہ یہ سب کیسے ہونے دے رہی ہیں۔وہ اس رشتے کے لیے کیسے مان گئیں۔سندس کا بھائی بیچ میں۔

نگینہ رانا کی ماں نے اپنے ہینڈ بیگ سے انگوٹھی نکال کر ستارہ کو زبردستی پہنا دی۔

''ہم اس ہی ماہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔وہ کیا ہے نا ہمارا بیٹا اگلے ماہ ہی جاپان جا رہا ہے۔تو جانے سے پہلے شادی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو گا۔کیوں سلیم صاحب فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے۔'' رانا صاحب (سندس کے ابو) پان چباتے ہوئے بولے۔

نگینہ رانا نے شوخ رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔بالوں کا بڑا سائز کا جوڑا کیا ہوا تھا۔ان کے دانت ہر وقت باہر رہتے تھے۔رانا صاحب پیچھے نہ تھا۔تنگ پاجامہ کے اوپر کرتہ پہنا ہوا تھا۔پان کھانے کے عادی تھے۔ان کا بیٹا جس کے ساتھ ستارہ کا رشتہ کیا تھا،وہ کچھ اور ہی مخلوق تھا۔اس کو تو شرم آ رہی تھی۔وہ ایک لفظ نہ بولا۔ستارہ نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتاری ادھر فرش پر پھینک کر چلی گئی۔

''آپ رشتہ پکا سمجھیں۔دو ہفتے بعد شادی کر دیتے ہیں۔ہماری طرف سے ہاں ہے۔''

سلیم نے فرش سے انگوٹھی اٹھائی۔''اس کی بدتمیزی کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔'' سرد لہجے میں بولا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد سلیم ستارہ کے کمرے میں آیا۔وہ سکول کا کام کر رہی تھی۔

''دو ہفتے بعد تمہاری شادی ہے۔خبردار جو آئندہ مہمانوں کے سامنے بدتمیزی کی تو۔وہ اب تمہارے سسرال والے ہیں۔اور تم کوئی چھوٹی بچی نہیں ہو ایسی حرکتیں کرو۔'' اس کے ہاتھ سے کتاب کھینچ کر دور پھینک دی۔

''میں یہ شادی کبھی نہیں کروں گی۔تم ماما کو تو پٹی پڑھا سکتے ہو مجھے نہیں۔میں اس جوکر خاندان میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔'' ستارہ کے الفاظ منہ میں تھے سندس عین موقع پر آدھمکی۔

''میرے گھر والے جوکر ہیں۔اچھا اور تم کیا ہو۔کبھی شکل دیکھی ہے اپنی آئینہ میں۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''بابا کی جو حالت ہے اس کی ذمہ دار تم ہو۔اگر تم نے شادی سے انکار کیا اور انہیں کچھ ہوا پھر دیکھنا۔'' سلیم اسے وارننگ دے کر چلا گیا۔سندس کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔وہ اس کا سکول بیگ ساتھ لے گئی۔ستارہ کا دل کیا اپنے سر کے بال نوچ لے۔آنسو بہانے کے علاوہ کچھ نہ کر پائی۔

''میں صبح بابا سے بات کروں گی۔ایسے کیسے میرا رشتہ طے کر دیا۔اور امی وہ کیوں کچھ بول نہیں رہیں۔''

ساری رات یوں ہی گزر گئی۔شدید ٹھنڈ میں وہ فرش پر لیٹ کر روتی رہی۔رو رو کر سر میں شدید درد ہونے لگا۔بڑی مشکل سے اٹھ کر دوا کھائی۔صبح جا کر آنکھ لگی۔

وہ صبح سب سے پہلے اپنے بابا کے پاس آئی۔اس کی حالت بہت خراب تھی۔مہینوں کی

بیمار لگ رہی تھی۔ آنٹی خدیجہ نے اسے بابا سے بات کرنے سے روک دیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ کچن میں لے گئیں۔

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اگر تم چاہتی ہو میں تمہیں تمہاری اس غلطی کے لیے معاف کر دوں تو چپ چاپ شادی کے لیے ہاں کہہ دو۔"

"میں آپ سے کتنی بار معافی مانگ چکی ہوں۔ آپ نے مجھے تب کیوں نہیں کہا کہ میں نے تمہیں اب تک معاف نہیں کیا۔" وہ چلا کر بولی۔

"آہستہ بولو۔ تمہاری وجہ سے تمہارے بابا کی یہ حالت ہوئی ہے۔ ابھی پھر ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔" کہتے کہتے رک گئیں۔

"تو کیا۔ آپ صرف سلیم بھائی کا ساتھ دے رہی ہیں۔ آپ کیسے میری شادی کر سکتی ہیں۔" اپنے بال نوچنے لگی۔ "میرے حال پر رحم کریں۔ میں نے شادی نہیں کرنی۔"

"تم میرے حال پر رحم کرو۔" اس کے بازوؤں کو دبوچا۔ "تمہارے بابا کی طبیعت خراب ہے۔ یاد رکھنا ستارہ والدین کی نافرمانی اللہ معاف نہیں کرتا۔"

ان کے ان الفاظ پر ستارہ خاموش ہو گئی۔ بس آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

حاجی اکرام کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ان کی حالت مزید خراب ہونے لگی۔ سلیم ان کا علاج محلے کے ڈاکٹر سے کروا رہا تھا۔ جبکہ انہیں اچھے ڈاکٹر اور علاج کی ضرورت تھی۔

دو ہفتے ایسے ہی گزر گئے۔ ستارہ سکول نہ گئی۔ عینی نے کئی بار چکر لگائے۔ سندس اس کو دروازے سے ہی واپس بھیج دیتی۔ حاجی اکرام پہلے سے اور بیمار پڑ گئے۔ اسد بھائی کو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ ستارہ اپنے بابا اور اسد بھائی سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پر اس کی والدہ نے اسے

اپنی قسم دی تھی۔ جب بھی اسد بھائی کا فون آتا۔ ہمیشہ سلیم ہی بات کرتا۔ ستارہ خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دیا تھا۔

آج اس کا نکاح اور رخصتی تھی۔ سندس اسے زبردستی پارلر لے گئی۔ حسن بھی گھر واپس آ گیا۔ ستارہ نے مدد کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی منہ موڑ لیا اور ہاتھ کھڑے کر لیے۔ لال رنگ کے شرارے کے اوپر لال رنگ کی کرتی پہنی تھی۔ کرتے کے بارڈر پر چاندنی کی تار سے کام ہوا تھا۔ سر پر جالی کا دوپٹہ لیا تھا۔ گلے میں سونے کا سیٹ تھا۔ جو اس کی ماں نے اسے پہنایا تھا۔

"اگر میں شادی سے انکار کر دوں۔ بغاوت کر دوں، تو کیا ہوگا؟ سلیم بھائی گھر میں تماشہ کر کے امی کو بھڑکائے گا۔ بابا کی طبیعت اور خراب ہوگی۔ ویسے بھی امی نے تو صاف کہہ دیا ہے۔ اگر میری نافرمانی کی تو روزِ قیامت اللہ کو بتاؤں گی۔ میرے بس میں کچھ نہیں۔ یا اللہ تو ہی میری مدد فرما۔"

وہ بت بنی اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھی ان چٹوں کو گھور رہی تھی۔ جو چٹیں سلیم نے پھاڑی تھیں۔ اس نے انہی کو ٹیپ سے جوڑ کر واپس چپکایا تھا۔ ان چٹوں پر اس کے خواب لکھے تھے۔

"می ڈین۔"

"بیسٹ ٹیچر آف ورلڈ۔"

"میرے سٹوڈنٹ میرا فخر۔"

"مل کر اچھی نسل پیدا کریں۔"

سندس بھابھی ساڑھی پہنے گردن اکڑائے اس کو لینے آئیں۔

''دیکھو تو ذرا میری نند یا میری بھابھی کیسی لگ رہی ہے۔کوئی نظر نہ لگائے۔ہاہاہا۔'' وہ یقیناً طنزاً ہنسی۔اپنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر کی۔''وہ کیا ہے ناں جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں۔تمہاری ماں یعنی میری ساسو ماں۔'' لفظوں پر زور دیا۔''ہر روز یہی طعنہ مارتی تھیں۔میری ماں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔اور میں نے بھی لو میرج کی ہے۔اس وجہ سے میرا خاندان برا ہے۔انہوں نے مجھے ابھی تک قبول نہیں کیا۔اور ستارہ میری جان، میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی۔جب تمہاری ماں نے سب کے سامنے میری اور میرے گھر والوں کی بے عزتی کی تھی۔اب حساب تو بنتا ہے۔دیکھو اللہ نے کیسے میری مدد کی۔کب سے چاہتی تھی تمہیں اپنی بھابھی بناؤں۔اور اللہ نے خود تمہیں ہماری جھولی میں ڈال دیا۔'' ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں نفرت صاف نظر آ رہی تھی۔

''اب نیچے چلیں مولوی صاحب آ گئے ہیں۔تمہارے بابا سو رہے ہیں۔لہٰذا کوئی تماشہ نہ کرنا۔ورنہ میں ایسا تماشہ کروں گی۔تمہارے باپ کے ساتھ تمہاری ماں بھی ہسپتال پہنچ جائیں گی۔'' دیوار پر لگے ان چٹوں کو اپنے ناخنوں سے نوچ دیا۔

سندس بھابھی اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال کر چلتی بنی۔لال جوڑے میں ملبوس لڑکی کی حالت آگے کنواں پیچھے کھائی جیسی تھی۔اگر شادی سے انکار کر دیا تو امی ساری زندگی معاف نہیں کریں گی۔اور اگر شادی کرے گی تو ساری زندگی طعنے سننے پڑیں گے۔

یہ بات اچھے سے سمجھ آ گئی اب آنسو صاف کرنے والا کوئی نہیں ہے۔اپنی جگہ سے اٹھی، زمین پر گری ان چٹوں کو، اپنے خوابوں کو، اپنے جوتوں کے نیچے روندتی ہوئی اس کمرے سے باہر چلی گئی۔

حاجی اکرام اپنے کمرے میں دواؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ان کی حالت کافی تشویش

ناک تھی۔نکاح سادگی سے کر دیا۔آنٹی خدیجہ تو خاموش تماشائی بنی ہوئی تھیں۔انہوں نے اپنے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔

رخصتی سے پہلے ستارہ اپنے بابا سے ملنے گئی۔وہ ابھی تک سو رہے تھے۔ان کی ٹیبل پر دوائیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔وہ اس بات سے انجان تھے کہ آج ان کی لاڈلی بیٹی کی رخصتی زبردستی ہو رہی ہے۔وہ ان سے گلے ملنا چاہتی تھی۔رو رو کر معافی مانگنا چاہتی تھی۔پر اس کی ہمت نہ ہوئی۔دل میں ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ان کی حالت کی ذمہ دار وہ خود تھی۔ان کے چہرے کے پاس ان کا رومال پڑا ہوا تھا۔ستارہ نے وہ نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا۔

آنٹی خدیجہ اس سے گلے ملنا چاہتی تھیں۔وہ سیدھا گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔حسن ایک بار بھی آگے نہیں ہوا۔سمجھ سے باہر تھا وہ خوش تھا یا دکھی۔سلیم ایسے تھا جیسے کوئی جنگ جیت لی ہو۔اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے۔وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر رانا صاحب، ساتھ والی سیٹ پر اس کا دولہا بیٹھا تھا۔جس کی اس نے شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔پچھلی سیٹ پر ستارہ اس کی ساس اور سندس براجمان ہوئے۔

ان کا گھر چھوٹا سا تھا۔نیچے ان کی مٹھائی کی دکان تھی۔اوپر ان کا گھر تھا۔اس چھوٹے گھر میں سندس کے اور دو شادی شدہ بھائی اپنی بیگمات اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔بڑے بھائی کی دو بیگمیں تھیں۔گھر میں بچوں کا کافی شور تھا۔دونوں بڑے بھائی کوئی سرکاری نوکری کرتے تھے۔نگینہ رانا اور اس کے شوہر کو اپنے بیٹوں کی نوکری پر بہت غرور تھا۔سندس بھی اس بات پر بہت اتراتی تھی۔

ستارہ اور اس کے شوہر کو سٹور روم والا کمرہ ملا تھا۔کمرے میں پرانا بیڈ تھا۔ایک طرف الماری اور دو لوہے کی پیٹیاں رکھی تھیں۔کمرے سے بدبو آ رہی تھی۔ایک چھوٹی کھڑکی تھی جو

گلی کی طرف کھلتی تھی۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے۔ جہیز تو تمہاری ماں نے دیا نہیں۔ اب اس ہی کمرے میں رہو۔ اور ایک بات میری یاد رکھنا۔ اس گھر میں صرف میرا حکم چلتا ہے۔'' نگینہ رانا اس کے گلے سے ہار اتار کر اپنے ساتھ لے گئیں۔

وہ ٹوٹی کرسی پر بیٹھی۔ گھر سے لڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اتنی شدید ٹھنڈ میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ شاید دولہے کی بھتیجی تھی جو ٹیبل پر کھانا رکھ کر چلی گئی۔ رات کو بارش ہونے لگی۔ اپنے بیگ سے شال نکال کر اوڑھی۔

دولہا کمرے میں آیا۔ اس کا قد بہت لمبا تھا۔ وہ بیڈ پر دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔

وہ پہلے ہی گھبرائی بیٹھی تھی۔ اپنے شوہر کو دیکھ کر غلطی سے پانی کی بوتل کو ہاتھ لگا۔ بوتل نیچے گر گئی۔ فرش سارا گیلا ہو گیا۔

''یہ کیا، کیا ہے تم نے؟'' وہ گولی کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اپنی دولہن کو گردن سے پکڑا۔

''میری کسی چیز کو خراب مت کرنا۔''

ستارہ کی سانس اکھڑنے لگی۔ وہ اس سب کے لیے کہاں تیار تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔ وہ چلا بھی نہ پائی بس آنسو نکلے۔

''مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔ یہ شادی زبردستی کی ہے۔''

ستارہ اس سے دور ہوئی۔ پٹی کے پیچھے زمین پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں دیکھ رہی ہو جیسے کوئی بھوت دیکھ رہی ہو۔

''مجھے پتا ہے میری ماں نے تمہیں سچ نہیں بتایا۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آیا۔ ''میری بات کان کھول کر سن لو۔ خبردار جو مجھے اپنا شوہر سمجھا۔''

''تمہارا بھائی سلیم سب جانتا تھا۔ مجھے۔ مجھے۔ مرد اچھے لگتے ہیں۔ بہت جلد تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' وہ بڑے آرام سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ پٹی کے ساتھ بیٹھی لڑکی کا دماغ گھوم گیا۔ ایسے لگا آسمان اس کے سر پر پھٹ گیا ہو۔ جو اس کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ اس کے وہم گمان میں نہ تھا۔

''اسے مرد اچھے لگتے ہیں۔ بس طلاق سمجھو۔'' اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ''یا اللہ یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں کس سے مدد مانگوں۔ میں اب کہاں جاؤں۔''

''بھائی کو سب معلوم تھا۔'' کھڑکی سے بارش کی بوندیں اندر آرہی تھیں۔ اٹھ کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

بارش اور تیز ہو گئی۔ نئی جگہ سے خوف آرہا تھا۔ دماغ میں سوچوں کا طوفان چلنے لگا۔ شال لے کر ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھی۔ آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''اسے مرد اچھے لگتے ہیں۔ تبھی سندس نے اپنے بھائی کی شادی مجھ سے کروائی ہے۔ کیا ماما کو ان سب باتوں کا علم تھا؟ وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔''

کمرے کے باہر سے قہقہوں کی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔ یہ سندس بھابھی کی آواز تھی۔ لازماً اپنی جیت پر جشن منا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں۔ ''کاش یہ ڈراؤنا خواب ہو۔''

☆......☆......☆

''اب کیسی طبیعت ہے۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ مجھ پر اوپر سے بہت پریشر ہے۔''

''سر ابھی بھی شاک میں ہے۔ شام تک ڈسچارج کر دوں گا۔ ویسے ابھی آپ بات تو کر سکتے ہیں۔''

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔میں اس سے اپنی جگہ لے جا کر سکون سے بات کروں گا۔“ ڈی ایس پی آفتاب نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”جیسا آپ بہتر سمجھیں۔میں اس کی میڈیکل رپورٹ تیار کر دیتا ہوں۔“ ڈاکٹر فائل تیار کرنے لگا۔

ڈی ایس پی آفتاب ڈاکٹر کے کیبن میں بیٹھے تھے۔تیمور کے کیس کو وہی انویسٹی گیٹ کر رہے تھے۔ڈاکٹر نے انہیں تیمور کی ڈسچارج رپورٹ تیار کر کے دے دی۔

تیمور ہسپتال میں تھا۔اس حادثہ کو دو دن ہو گئے تھے۔وہ ابھی تک شدید شاک میں تھا۔وہ ٹکٹکی باندھ کر بس چھت کو گھورتا۔اس کی ساری زندگی ایک لمحے میں تلپٹ ہو گئی تھی۔

”چلو جی بڑا آرام کر لیا ہے۔“ کانسٹیبل سینہ تان کر کھڑا ہوا۔”اب تھوڑا آرام ہم بھی کر لیں۔“

نرس نے اس کی ڈرپ اتاری۔اس کا بلڈ پریشر چیک کیا۔اس کو فائل میں درج کیا۔وہ فٹافٹ اپنا کام نبٹا رہی تھی۔اس کی دوائیاں میز پر رکھ دیں۔فائل اٹھائی اور روم سے نکل گئی۔

تیمور اٹھ کر بیٹھا۔وہ ہسپتال کے لباس میں تھا۔پولیس کانسٹیبل اپنی چھڑی پکڑے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔وہ ہمت کر کے بیڈ سے نیچے اترا۔

”میرے سلیپر۔مجھے گھر جانا ہے؟“ وہ منہ میں بڑبڑایا۔

”جو پاس پڑے ہیں وہی پہنو۔“ پولیس کانسٹیبل سخت لہجے میں بولا۔اس کے پیروں کے پاس ایک پرانی ٹوٹی ہوئی استعمال شدہ جوتی پڑی ہوئی تھی۔

”یہ کسی اور کی ہے۔“ اشارہ کیا۔

”اچھا۔تو صاحب جی کون سے برانڈ کے سلیپر پہننا پسند کریں گے۔“ وہ یقیناً طنز کر رہا تھا۔

”مجھے وکیل سے ملنا ہے۔“ وہی جوتی پہن لی۔

”میں لے کر چلتا ہوں۔ ذرا چل تو۔“ پھر طنزاً بولا۔

رات ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شدید ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ کانسٹیبل اسے ہسپتال کے پچھلے دروازے سے لے کر باہر آیا۔ اسے پولیس وین میں بٹھایا جو پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ وہ اس کو لے کر پیچھے بیٹھ گیا۔ جہاں دو اور پولیس والے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے پکڑے بیٹھے تھے۔

”شکر کر تجھے سامنے کے دروازے سے نہیں لے گیا صاحب کا خاص آرڈر تھا۔“ پولیس کانسٹیبل نے دروازہ زور سے بند کیا۔

چودہ سالہ لڑکے نے حیرت سے پولیس وین کا معائنہ کیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے گاڑی تیزی سے بھگا دی۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“ تیمور پھر بولا۔ وین کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھا۔

”گھر لینے کیا جانا ہے۔ تیرے باپ کا جنازہ آج صبح ہو گیا ہے۔“

”کس کا جنازہ۔“

”تیرے باپ کا جنازہ۔ آج دفنا دیا۔“ اسے لال آنکھوں سے گھورا۔

تیمور پر جیسے بم گرا۔ پروفیسر شکیل رضا ہاشمی اس دنیا میں نہیں رہے اور ان کا جنازہ بھی ہو گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو اس نے سنا تھا۔ اس نے پلک بھی نہیں جھپکائی۔ دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مانو ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔

”پاپا کا جنازہ۔ آج صبح دفنا دیا۔“

پولیس وین تیزی سے راستہ بناتی ہوئی تھانے میں جا کر رکی۔ وین کا دروازہ کھلا، وہ سارے پولیس والے اترے۔ تیمور بت بنا بیٹھا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا اسے کہاں لائے ہیں۔

”چل شہزادے، تیری منزل آ گئی۔“ اسے بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ وہ چپ چاپ ان

کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس لڑکے کو ایک اندھیرے کمرے میں لا کر کرسی پر بٹھایا۔ سامنے لکڑی کی میز تھی۔ میز کے سامنے ایک اور کرسی تھی۔ چھت پر ایک بلب جل رہا تھا۔

ڈی ایس پی آفتاب اس خالی کرسی کو کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹکائے۔

”صرف ایک بار پوچھوں گا۔ میرا وقت ضائع مت کرنا۔ صرف دو سوال بس۔ اپنے باپ کو کیوں اور کیسے مارا۔“

”کیا مطلب۔“ اسے کچھ ہوش آیا۔ تیمور کے پیچھے وہی پولیس والے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے کھڑے تھے۔ جو اس کے ساتھ وین میں آئے تھے۔

”پھر سے آرام سے پوچھ رہا ہوں۔ کیوں اور کیسے۔“ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”میں اپنے پاپا کا قتل کیوں کروں گا۔“ اس دن کی خبریں اس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔ ”آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میں تیمور رضا ہاشمی اپنے باپ کا قتل۔“ اپنے الفاظ روک دیے۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ تیمور کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

”دماغ تمہارا ٹھیک کرنے والا ہے تیمور رضا ہاشمی۔ کرائم سین سے تمہارے باپ کی لاش کے پاس ہمیں ایک گن ملی۔ جس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اس وقت صرف تم ان کے پاس تھے۔ اب یہ بتاؤ قتل کیسے کیا۔ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”میں۔“ اس کے آنسو بہنے لگ گئے۔ ”مجھے۔ مجھے وکیل سے بات کرنی ہے۔ مجھے اپنے باپ کے قاتلوں کو پکڑوانا ہے۔“ وہ جانے کے لیے کرسی سے اٹھا۔

”ادھر بیٹھ۔“ کانسٹیبل نے اسے پکڑ کر کرسی پر واپس دھکیلا۔

"ہمارے پاس ثبوت ہیں۔ تم نے ہی اپنے باپ کا قتل کیا ہے۔ آرام سے اپنا جرم قبول کر لو۔ ورنہ میرا دماغ گھوما وہ حشر کروں گا، اپنا شکل پہچان نہیں پاؤ گے۔" ڈی ایس پی آفتاب نے میز کے اوپر سے اسے گریبان سے اپنی طرف کھینچا۔

"میں نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔" پہلی بار چلایا۔ "میں نے مقدمہ درج کروانا ہے۔ اپنے باپ کے قاتلوں کو پکڑوانا ہے۔" اس نے اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش۔ اس کی بات پر ڈی ایس پی آفتاب نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کرسی پر جا کر گرا۔ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ آفتاب قہقہہ لگا کر ہنسا۔ باقی پولیس والے بھی زور سے ہنسے۔ تیمور پہلی بار گھبرایا۔

"تو آپ نے کیس کرنا ہے۔ اچھا جی۔ یہ بتاؤ تو صحیح کس کے خلاف کیس کرنا ہے۔ مجرم کون ہے؟"

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"مجھے یہاں سے جانا ہے۔ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔"

"اپنا جرم قبول کر لو۔ اب اگلی ملاقات عدالت میں ہوگی۔ تم دونوں کے پاس صبح کا وقت ہے۔" اس نے ان کانسٹیبلوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر اس نے صبح تک سچ نہ بولا تو یاد رکھنا۔ تو اسے بتانا یہ ڈی ایس پی کس بلا کا نام ہے۔" تیمور کا سر پکڑ کر میز سے لگایا۔ "میرا وقت ضائع مت کرنا۔ ورنہ۔"

تیمور کی آواز نہ نکلی۔ وہ ان سب کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ ڈی ایس پی آفتاب اس کو چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ کانسٹیبل اس لڑکے کو پکڑ کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا۔

”سچ بتا قتل تو نے کیا ہے؟“ اس نے ڈنڈا اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔ اس کانسٹیبل نے اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ وہ ان سب کے لیے کہاں تیار تھا۔ اس کی چیخوں کی آواز پورے کمرے میں گونجنے لگیں۔ وہ رکا پھر بولا۔

”قبول کر قتل تو نے کیا ہے؟“

وہ لڑکا اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ درد کی وجہ سے چیخ رہا تھا۔ اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ کانسٹیبل پھر ڈنڈے برسانے لگا۔

”تجھے آدھے گھنٹے کا وقت دیتا ہوں۔ سوچ لے اور سچ بول۔ ورنہ اس سے بھی برا حشر کروں گا۔“ اس نے کہا اور دروازے کو باہر سے لاک کر دیا۔ تیمور فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی سانس بمشکل چل رہی تھی۔ پورے جسم پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ وہ درد سے کراہ رہا تھا۔

تیمور رضا ہاشمی جس سے کبھی کسی نے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ آج اس حال میں تھا کوئی اس پر افسوس کرنے والا نہ تھا۔ وہ جو اپنے پلان بنا کر چلتا تھا۔ آج کسی اور کے پلان کا شکار ہو گیا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ فرش ٹھنڈا تھا۔ وہ زمین پر سکڑ کر لیٹ گیا۔ ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بھوک سے جان نکل رہی تھی۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

”پاپا! مجھے بچا لیں۔“ وہ ادھر ہی بے ہوش ہو گیا۔ شکیل رضا ہاشمی کا چہرہ یاد آ رہا تھا۔

وہ ساری رات یونہی پڑا رہا۔ صبح کانسٹیبل نے آ کر دروازہ کھولا۔ وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اس کو اپنے جوتوں سے ٹھوکر ماری۔

”اٹھ جا بڑا، آرام کر لیا ہے۔ اٹھ بڑے صاحب آ رہے ہیں۔“

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ سوتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

کانسٹیبل نے سے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''باپ کا گھر سمجھا ہے، اٹھ۔''

بھوک کی وجہ سے اس کی جان نکل رہی تھی۔ وہ ایک ہی رات میں کافی کمزور ہو گیا تھا۔ کانسٹیبل اسے گھسیٹتا ہوا رات والے کمرے میں لایا۔ میز پر تھال میں روٹی کے ساتھ دال تھی۔ سٹیل کے گلاس میں پانی تھا۔

''چپ چاپ کھانا کھا لے۔ بڑے صاحب آنے والے ہیں۔'' اس نے تیمور کو کرسی پر بٹھایا۔ خود کمرے سے نکل گیا۔ جو رات کو مار پڑی تھی۔ ان کی تکلیف اب جسم سے اٹھ رہی تھی۔ بھوک اور پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ ہاتھوں پر ڈنڈے کے نشانات تھے۔ بڑی مشکل سے گلاس سے پانی کا گھونٹ پیا۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا اسے قے آ گئی۔ سردی سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ وہ زمین پر اکڑوں لیٹ گیا۔ اسے اس جگہ سے وحشت ہونے لگی۔

''کچھ بولا۔'' ڈی ایس پی آفتاب کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا۔ ''جتنا جلدی جرم قبول کر لے اتنا اچھا ہے۔'' مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

''صاحب! وہی رٹ لگا رکھی جو ہر مجرم لگاتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا میں بے قصور ہوں۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''اسے جلد از جلد ٹھیک کرو۔ کورٹ میں پیش کرنا ہے۔ سارے ثبوت اس کے خلاف ہیں۔ تگڑا کیس ہے اس پر۔ بچ کر نہیں جانے والا۔ میں نہیں چاہتا یہ اپنی کم عمری کی وجہ سے فائدہ اٹھائے۔''

''سر بڑے باپ کی اولاد ہے اور۔''

''بڑے باپ کی اولاد تھی۔'' اس کی بات کاٹ دی۔ ''باپ مر گیا کہانی ختم۔ اب کون

آئے گا اس کو بچانے کے لیے۔ تڑپتا رہے ساری زندگی جیل میں۔"

"سر! میڈیا والے بڑا شور کر رہے ہیں۔ ہر طرف یہی خبر ہے۔ ایک بیٹے نے اپنے باپ کو گھریلو ناچاقی کی وجہ سے گولی مار دی۔ سر وہ جو ہوتے ہیں نا انسانیت کے لیے کام کرنے والے۔ وہ اس کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔" کانسٹیبل سوچتے ہوئے بولا۔

"یونیورسٹی کے سٹوڈنٹس بھی احتجاج کر رہے ہیں۔ پر کوئی بات نہیں پرسوں اس کی عدالت میں پیشی ہے۔ سخت سیکورٹی میں لے کر جائیں گے۔ میں بھی دیکھتا ہوں کوئی کیا کر لے گا۔" اتنا کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر چلا گیا۔

کانسٹیبل نے اسے جگایا۔ جب وہ نہ ہلا۔ اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی اٹھایا۔

"چل میرے ساتھ، نہیں کھانا تو نہ کھا۔ میری طرف سے بھوکا مر۔" اسے پھر دوسرے کمرے میں لایا۔ "یہ کپڑے بدل جلدی کر۔ نہ بدلے تو دیکھنا آکر تیرا کیا حشر کروں گا۔"

مجرموں والا سوٹ اس کی طرف اچھال دیا۔ اس کو گالیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ تیمور کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بڑی ہمت کر کے مجرموں والا لباس پہنا۔ پولیس کانسٹیبل دوبارہ آیا۔

"چل میرے ساتھ۔" اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کمرے میں ایک ہٹا کٹا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک باکس تھا۔

"تیرے پاس پانچ منٹ ہیں۔" کانسٹیبل اس شخص سے مخاطب ہوا۔

"ادھر بیٹھ جلدی کر۔" اس شخص نے تیمور کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک سٹول پر بٹھایا۔ تیمور کی ڈر کے مارے جان نکلنے لگی۔ اس نے فوراً اپنا باکس کھولا۔ اس سے استرا نکالا۔ اس سے پہلے وہ کوئی حرکت کرتا۔ اس نے تیمور کے بال پیچھے سے کاٹ دیے۔

وہ اپنے بال سیلون سے کٹواتا تھا۔ آج نائی نے مشین چلائی اور ایک وار میں اس کے

کندھے تک آتے بال کاٹ دیئے۔ وہ چیخ مار کے اٹھا۔ کانسٹیبل نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر ماردیا۔ وہ ادھر زمین پر گر گیا۔ شاید بیہوش ہوگیا۔

شام کو جا کر اس کی آنکھ کھلی۔ درد کی وجہ سے جسم ہل نہیں پا رہا تھا۔ بھوک اور ٹھنڈ نے علیحدہ زندگی عذاب بنادی تھی۔ کمرے میں پیلے رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہورہی تھی۔ وہ کئی بار چیخا، زور زور سے چلایا۔ پر اس کی آواز کسی نے سنی۔

''میں نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔ مجھے جانے دو۔'' اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ ٹھنڈے فرش پر سکڑ کر لیٹ گیا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔

اندھیرے کمرے میں اپنا عالیشان گھر یاد آیا۔ اپنا کمرہ یاد آیا جس میں ہیٹر چل رہا ہوتا۔ وہ اپنے بستر پر رضائی میں مزے سے لیٹا ہوتا۔

''کیا مجھے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ کیا میں تیمور رضا کسی کو یاد نہیں۔''

''میں نے اپنے پاپا کا قتل نہیں کیا۔'' آنسوؤں سے اس کی ساری شرٹ بھیگ گئی۔ ''کس نے مارا ہے میرے پاپا کو۔''

کافی رات ہو چکی تھی۔ جب اس کمرے کا دروازہ کھلا۔ تیمور کی ہلکی سی آنکھ کھلی۔ وہی کانسٹیبل کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ایک پلیٹ اس کے آگے رکھی۔ اس میں دال اور روٹی تھی۔

''آخری بار کہہ رہا ہوں کھالے۔ کیوں بھوکا مرنا ہے؟ ویسے جو بھی تیرے گھر والے ہیں۔ ان کو تیری کوئی فکر نہیں۔ تیرے فائدے کی بات کرتا ہوں۔ اپنا جرم قبول کرلے۔'' اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

وہ اپنی آنکھیں موند کر لیٹا رہا۔ وہ کانسٹیبل کافی دیر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا۔ کمزوری کی وجہ سے پھر سو گیا۔ جب اٹھا تو صبح ہورہی تھی۔ دال روٹی سامنے پڑی تھی۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

روٹی کا ایک ٹکڑا توڑا۔سردی سے روٹی اکڑ چکی تھی۔ زندہ رہنے کے لیے پیٹ پوجا کرنی تھی۔روٹی کا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔روٹی باسی اور خمیری تھی۔ قے آئی پھر بھی بڑی مشکل سے اسے نگل لیا۔بھوک تو بہت لگی تھی۔نہ چاہتے ہوئے لیٹے لیٹے ساری روٹی بنا پانی اور دال کے کھا گیا۔

''کل عدالت میں جانا ہے۔سچ بولوں گا میں نے اپنے پاپا کا قتل نہیں کیا۔وکیل میری بات ضرور سنیں گے۔پھر میں اپنے گھر جاؤں گا۔'' اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔روٹی کھا کر ذرا جسم کو سکون ملا۔پر ٹھنڈ سے برا حال ہو رہا تھا۔اپنے پاپا کو یاد کرنے لگا۔نیند غالب آئی تو پھر گہری نیند سو گیا۔اگلا سارا دن بھی وہ اس کمرے میں تنہا رہا۔

آج اس کی عدالت میں پیشی تھی۔ڈی ایس پی آفتاب کے سامنے بیٹھا تھا۔

''تو ابھی اٹھارہ سال سے چھوٹا ہے۔اس لیے تیرا لحاظ رکھا ہے۔ورنہ ابھی تک تو نے اپنا جرم قبول کر لیا ہوتا۔''

''میں جج کو سب سچ بتاؤں گا۔میں نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔تم لوگ مجھ پر غلط الزام لگا رہے ہو۔'' اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

''ہاہاہا اچھا جی۔پھر کیا ہو گا؟ ہوں۔چلو چل کر دیکھ لیتے ہیں۔'' ڈی ایس پی نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔کانسٹیبل کو اس کو لے کر چلنے کا اشارہ کیا۔

تیمور مجرموں کے لباس میں تھا۔اسے تھانے سے باہر پولیس وین کے پاس لایا۔آج کافی دنوں بعد اس نے آسمان کی شکل دیکھی تھی۔

''دیکھ لے بیٹا دیکھ لے آسمان۔اگلی بار نہ جانے کب دیکھنے کو ملے۔'' اس ہی کانسٹیبل نے اس کے دونوں ہاتھوں پر ہتھکڑی لگائی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ احتجاجاً چیخا۔

"اپنی بکواس بند رکھ۔" اس پر کالی شال ڈال دی۔ تین پولیس اہلکار پہلے سے وین میں بیٹھے تھے۔ اسے زبردستی پولیس وین میں بٹھایا۔

وین تھانے سے نکلی اور عدالت کی طرف چل پڑی۔ پولیس وین کے آگے ڈی ایس پی کی گاڑی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہتھکڑی سے آزاد کرنے کی کوشش رہا تھا۔

"اسے میرے ہاتھ سے اتارو۔ میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔"

"سکون سے بیٹھ جا ورنہ ادھر تیرا حشر کر دوں گا۔"

جب کچھ نہ بن سکا وہ آرام سے بیٹھ گیا۔ شاید خوش فہمی کا شکار تھا۔ جج اس کی بات سن کر اس پر یقین کریں گے اور اسے گھر بھیج دیں گے۔

وین عدالت کے سامنے رکی۔ پولیس اہلکار وین سے نیچے اترے۔ اس لڑکے کو ہتھکڑی سے پکڑ کر باہر نکالا۔ اسے اپنے ساتھ عدالت کے اندر لے گئے۔

دن کے دس بج رہے تھے۔ عدالت میں روزمرہ کی طرح رش تھا۔ پولیس والے میڈیا کی نظروں سے بچا کر لائے تھے۔ وہ ہتھکڑیاں میں جکڑا پولیس اہلکاروں کے ساتھ سر جھکائے چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ایک نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں کوئی اس کا اپنا نہ تھا۔

دل میں خیال آیا۔ زور سے چلائے، زور سے چیخے، سب کو بتائے۔ وہ تیمور رضا ہاشمی اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ تو ہواؤں میں اڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ اس قید میں نہیں رہ سکتا۔

کمرہ عدالت کے باہر رکے۔ ڈی ایس پی آفتاب اس کو چبھتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ

اب شاک میں تھا اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس نے تو اپنے باپ کے جنازے کو کندھا تک نہیں دیا۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزم تیمور رضا ہاشمی جس پر اس کے باپ پروفیسر شکیل رضا ہاشمی کے قتل الزام میں لایا گیا ہے۔ اسے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ کٹہرے میں لانے سے پہلے اس کے ہاتھوں کو ہتھکڑی سے آزاد کر دیا۔

جج صاحبہ ایک خاتون تھیں۔

''مجرم پر الزام ہے۔ اس نے یکم جنوری کو اپنے سگے باپ کا قتل کیا تھا۔ کرائم سین کے پاس سے ایک گن برآمد ہوئی تھی۔ جس پر مجرم کے ہاتھ کے نشانات واضح ہیں۔ جب فائرنگ ہوئی تب گھر پر ان باپ بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔''

جج صاحبہ نے کیس پر نظر ڈالی۔ وہ ساتھ میں تیمور کی ایف آئی آر رپورٹ بڑے غور سے پڑھ رہی تھیں۔ رپورٹ ایک دم کلیئر تھی۔

''وہ ابھی مجرم ثابت نہیں ہوا۔ ابھی ملزم ہے۔ ملزم کی طرف سے وکیل کون ہے۔'' ان کا لہجہ سخت اور شفاف تھا۔

تیمور کٹہرے میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ سے سب کچھ باہر تھا۔ یہ دنیا اس نے پہلی بار اپنی زندگی میں دیکھی تھی۔ فلموں میں کورٹ روم اس حقیقی دنیا سے بالکل مختلف تھے۔

''ابھی تو کوئی وکیل نہیں ہے۔ آج عدالت کی پہلی کارروائی ہے۔'' وکیل امجد ابھی حال ہی میں وکیل بنا تھا۔ وہ تیمور کے خلاف کیس لڑ رہا تھا۔

''میں نے اپنے پاپا کا قتل نہیں کیا۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔'' تیمور فٹ سے بولا۔ ''میں نے اپنے پاپا کا قتل نہیں کیا۔''

”آپ کو بولنے کا پورا حق دیا جائے گا۔عدالت کی طرف سے آپ کو وکیل ملے گا۔آپ نے جو کہنا ہے ان سے کہنا۔اگلی بار اجازت کے بغیر مت بولنا۔“جج صاحبہ نے اپنی عینک کے اوپر سے کٹہرے میں کھڑے لڑکے کو دیکھا۔

”عدالت کی کارروائی اگلے ہفتے ہوگی۔آج کیس کی سماعت ادھر ختم ہوتی ہے۔“

اس سے پہلے تیمور دوبارہ کچھ کہتا۔کانسٹیبل اسے کٹہرے سے نیچے لایا۔اسے کمرۂ عدالت سے باہر لے گیا۔اسے دوبارہ ہتھکڑی لگائی۔ڈی ایس پی آفتاب وکیل امجد سے بات کرنے کے لیے رک گیا۔پولیس اہلکار اسے لے کر وین تک پہنچے۔کچھ میڈیا کے لوگوں نے اسے گھیر لیا۔

”آپ نے اپنے باپ کا قتل کیوں کیا۔“

”آپ اپنے باپ سے کس بات پر ناراض تھے کہ آپ نے ان کی جان لے لی۔“

”کیا اپنے باپ کا قتل کرتے وقت ذرا ڈر نہیں لگا۔“

میڈیا کے لوگ ہاتھ میں مائیک پکڑے مختلف سوالات پوچھ رہے تھے۔کانسٹیبل نے اسے واپس پولیس وین میں بٹھایا۔وہ ان سب سے بھاگنا چاہتا تھا۔اس کا صبر جواب دے گیا۔چھوٹے بچوں کی طرح رونے لگا۔

اسے واپس تھانے لایا۔پولیس وین سے اتارا۔

”یہ شروعات ہے۔اب دیکھ تیرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔میں نے گولی نہیں چلائی۔“پہلی بار چیخا۔

”اپنی یہ سچائی کسی اور کو بتانا۔ابھی تو ہمارے لیے صرف ایک مجرم ہے۔“

کانسٹیبل اسے اندر لے جانے لگا۔اس کی نظر وین کے شیشے پر پڑی۔اپنا عکس چند دنوں بعد دیکھا۔اس کے سر سے بال غائب تھے۔وہ گنجا تھا۔اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔سیاہ

حلقے پڑ گئے تھے۔

وہ۔وہ تیمور ہر گز نہ تھا۔وہ پورا بدل گیا تھا۔کانسٹیبل اسے واپس لا کر اس کمرے نما جیل میں بند کر دیا۔وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

"دروازہ کھولو میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ کافی دیر تک دروازہ پیٹتا رہا۔کانسٹیبل واپس آیا۔اس بار اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔اسے گالیاں نکالیں۔

"ایک بار اور آواز نکالی دیکھ تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔" اپنا سارا غصہ اس پر نکال کر چلتا بنا۔

تیمور کی حالت بہت بری ہو گئی۔وہ ملنے کے قابل نہ رہا۔بنا آواز کے روتا رہا، آنسو بہاتا رہا۔تکلیف اتنی زیادہ تھی اسے ٹھنڈ بھی نہیں لگ رہی تھی۔کمزوری کی وجہ سے پھر بیہوش ہو گیا۔

رات کے تقریباً دو بجے اسے ہوش آیا۔اس کے ہاتھوں میں اب بھی ہتھکڑی تھی۔اس کے ہاتھ سوجھ گئے تھے۔وہی دال روٹی اس کے سامنے پڑی تھی۔

بڑی مشکل سے اپنی انگلیوں سے روٹی کا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈالا۔روٹی میں نمک بہت زیادہ تھا۔گھر تو تھا نہیں کہ نخرے کرتا۔کھانا پسند نہیں تھا، تو آڈر کر لیتا۔سوکھی روٹی کھا گیا۔

وہ منظر۔باپ کی لاش خون سے بھری ہوئی۔اس کی نظروں کے سامنے آیا۔اس کا سارا وجود لرز گیا۔

ایک اور دن گزر گیا۔وہ اس ہی حال میں پڑا رہا۔وقتاً فوقتاً پولیس والے آ کر اس سے طرح طرح کے سوال کرتے رہتے۔اس نے اب جواب دینا چھوڑ دیا تھا۔

لڑنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔باپ زندہ تھا تو ہر کام چٹکیوں میں ہو جاتا۔تلخ زندگی کی ایک بوند اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔آج عدالت کی طرف سے ایک وکیل اس سے ملنے آئی۔دونوں کرسی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔اتنے دونوں بعد کوئی اس سے پیار سے

بات کر رہا تھا۔

"تیمور میں سید حامد سے پر آتی ہوں۔ اگر تم نے گولی نہیں چلائی تو تمہارے خیال میں اور کون ہو سکتا ہے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں بھلا اپنے باپ کا قتل کیوں کروں گا۔"

"اپنے دماغ پر زور دو۔ تم کہہ رہے ہو تم واش روم گئے تھے ہاتھ دھونے پھر۔"

"میں نے اس رات امریکہ جانا تھا۔ پاپا کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے واش روم گیا۔ میرے ایک کان میں ہینڈ فری لگا تھا۔ جب میں واپس آیا۔ ابھی کمرے کے دروازے میں تھا تو گولی چلنے کی آواز آئی۔"

"اور کچھ؟"

"آپ ایک سوال بار بار پوچھ رہی ہیں۔ میں نے اپنے پاپا کو نہیں مارا۔"

"ایک سوال اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ شاید تمہیں کوئی بات یاد آ جائے۔ تمہارے خلاف کیس بہت سٹرونگ ہے۔ تمہارے پاس کوئی گواہ نہیں جس سے تم اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکو۔"

"مجھے صرف یہ معلوم ہے۔ میں نے اپنے پاپا کا قتل نہیں کیا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی ثبوت کوئی گواہ۔ عدالت صرف ثبوتوں پر بھروسہ کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس ایک بھی نہیں۔"

وکیل مریم کی عمر زیادہ تھی۔ وہ زیادہ تر بچوں کے کیس ہینڈل کرتی تھی۔ ان کا تجربہ کافی زیادہ تھا۔

"تمہارے گھر میں سے کوئی نہیں آیا۔ کوئی فرینڈ یا تمہارے پاپا کا کوئی دوست۔ کوئی انکل

یاں کوئی آنٹی۔"

"شاہدہ بیگ میرے پاپا کی سیکنڈ وائف ہیں۔ان کے ایک بھائی ہیں جو اکثر ہمارے گھر میں آتے تھے۔پاپا انہیں ذرا پسند نہیں کرتے تھے۔میرے دوست ہیں پر پتا نہیں کہاں ہیں۔" سوچتے ہوئے بولا۔

"یہ بتاؤ تمہاری امی اور ابو کے آپس میں تعلقات کیسے تھے۔دیکھو سچ بولنا؟"

"وہ میری امی نہیں ہیں۔زیادہ تر میری وجہ سے لڑتے رہتے تھے۔"

"اچھا" اپنی فائل پر نوٹ کیا۔"اور شاہدہ بیگ کے بھائی۔شکیل رضا انہیں کیوں پسند نہیں کرتے تھے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔مجھے تمہارے کیس پر بہت کام کرنا ہے۔ابھی میں چلتی ہوں۔دو دن بعد عدالت میں ملاقات ہوگی۔"

"تب میں گھر جا سکتا ہوں۔" چہرے پر ایک چمک آئی۔

"میں تم کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔تمہارا کیس بہت ویک ہے۔تمہارا بچنا مشکل ہے۔تمام میڈیا اور سوشل میڈیا پر تم صرف ایک مجرم ہو۔جب یہ خبر میڈیا پر آئی تھی۔تو لوگ تمہیں بہت برا بھلا کہہ رہے تھے۔تمہیں بد دعائیں دے رہے تھے۔" اپنی کرسی سے اٹھیں۔

"شاید لوگ تمہیں چند دنوں تک بھول جائیں۔پر تم میری ایک بات یاد رکھنا۔تم اب تیمور رضا ہاشمی نہیں رہے۔صرف ایک گم نام تیمور ہو۔"

"جب تک باپ زندہ ہے تب تک عیش ہیں۔" اس بوڑھے شخص کی بات یاد آئی۔

"تم اس سے مدد کیوں نہیں مانگتے۔" دروازہ کھلا، تیمور کی پشت اس کی طرف تھی۔

"کس سے۔"

"اللہ سے۔" وہ دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

کانسٹیبل اسے واپس اس کمرے میں بند کر گیا۔ وہ ٹھنڈے فرش پر لیٹا۔ وکیل مریم نے کہا سب کی نظر میں تم صرف ایک مجرم ہو۔ آنکھیں بند کرتا تو باپ کی لاش خون سے بھری ہوئی نظر آتی۔ اپنی آنکھیں کھولتا تو کانوں میں میڈیا کے سوالات گونجتے۔

وہ اٹھ کر کمرے میں چکر لگانے لگا۔ کمزوری اور چوٹوں کی وجہ سے تھک کر بیٹھا پھر لیٹ گیا۔ وہ تیمور رضا ہاشمی تھا پر اب اس کا کانفیڈنس ختم ہو گیا تھا۔ تھانوں میں بڑے بڑے مجرم پولیس کی مار کھا کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ وہ تو ابھی چودہ سال کا بچہ تھا۔ جو جلد ہی پندرہ سال کا ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی کا آڈیٹوریم سٹوڈنٹس سے بھرا ہوا تھا۔ سٹیج پر کچھ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے ساتھ دوسری یونیورسٹی سے آئے پروفیسرز کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ کچھ سینئر پروفیسر دوسرے ملکوں سے آئے تھے۔ چونکہ وہ مہمان تھے۔ لہٰذا ان کی مہمان نوازی میں کسی قسم کی کمی نہیں رکھی گئی تھی۔

"ہمارا آج کا ٹاپک سٹوڈنٹس کا فیوچر ہے۔" یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "سٹوڈنٹس میں صرف آپ شامل نہیں ہوتے بلکہ آپ کی آنے والی نسلیں بھی شامل ہوتی ہیں۔"

ان کے لہجے میں بہت رعب تھا۔ پورے آڈیٹوریم میں خاموشی چھا گئی۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ سٹوڈنٹس ان کی باتیں نوٹ کرنے کے لیے ہاتھوں میں پین پکڑے

بیٹھے تھے۔

''مجھے کئی سال ہو گئے ہیں سٹوڈنٹس کو پڑھاتے ہوئے۔ان سالوں میں میرا تقریباً ہر طرح کے سٹوڈنٹ سے پالا پڑا ہے۔بہت سے ایسے سٹوڈنٹس تھے۔جن کی ذہانت پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔وہ ہمیشہ ٹاپ کرتے تھے۔پر وہ اپنی پرسنل لائف میں فیل ہو گئے۔جانتے ہیں کیوں؟ باادب بامراد بے ادب بے مراد۔انہوں نے علم حاصل کر لیا۔پر ادب کرنا نہیں سیکھا۔اس لیے زندگی کی دوڑ میں ہار گئے۔ادب صرف اپنے سے بڑے کا نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب، رشتہ دار، اپنا ملک، اپنی جاب، فیملی، اولاد، استاد، دوست، وقت، اردگرد کے لوگ ہر کوئی اس میں شامل ہوتا ہے۔

اگر آپ نے اپنی زندگی میں کامیاب ہونا ہے تو ادب کرنا سیکھیں۔ہمارے بزرگوں نے بھی اس بات پر زور دیا ہے۔جو ادب نہیں کرتا وہ خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔دنیا میں جتنے بھی شعبے ہیں۔ان میں جتنے بھی ترقی یافتہ لوگ ہیں۔ان تمام لوگوں میں ایک چیز کامن ہوگی۔وہ ادب کرنا جانتے ہیں۔

والدین کا ادب سب سے پہلے آتا ہے۔آپ اچھے سے جانتے ہیں والدین کی نافرمانی دوسرا بڑا شرک قرار دیا گیا ہے۔والدین کے آگے اف کہنا بھی گناہ ہے۔ہمارے مذہب نے ادب کو بہت اہمیت دی ہے۔''

آڈیٹوریم کی پچھلی نشستوں میں نور بی بی بھی بیٹھی تھی۔وہ سر کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ جب سے اس کی پروفیسر حلیمہ سے ملاقات ہوئی تھی۔تب سے اس میں کچھ تبدیلی آئی تھی۔ جہاں اچھی گفتگو ہو رہی ہوتی یا کچھ سکھایا جا رہا ہوتا، وہ ادھر بیٹھ جاتی۔

''دوسری طرف ایسے والدین بھی ہوتے ہیں۔جو اپنے بچوں کو ٹائم نہیں دیتے۔ہر وقت

اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔اپنے اولاد کی قدر نہیں کرتے۔ایک وقت آتا ہے اولاد بھی اپنی دنیا میں مصروف ہو جاتی ہے۔اور جب والدین بڑھاپے کو پہنچتے ہیں تو بس پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔بس آپ سے اتنا کہوں گا۔ادب کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔یہ آپ کے فیوچر میں بھی کام آئے گا۔"

پروفیسر مختصر سی بات کر کے اپنی نشست پر چلے گئے۔ان کے بعد ایک اور پروفیسر مائیک پر تشریف لائے۔وہ کافی عمر رسیدہ انگریز پروفیسر تھے۔

"میرا نام جان ہیری ہے۔میں کینیڈا سے خاص آپ سٹوڈنٹس کے لیے آیا ہوں۔مجھے پرسنلی پاکستان بہت پسند ہے۔خاص طور پر یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔مجھے یہاں کے کھانے بہت پسند ہیں۔اکثر ہوٹل والے ہمیں فری میں کھانا دیتے ہیں۔آپ ہمارے مہمان ہیں۔مجھے یہ چیز بہت پسند ہے۔"

پورے آڈیٹوریم میں تالیاں بجنے لگیں۔

"یہاں سٹوڈنٹس کے فیوچر کی بات ہو رہی ہے۔میں نے اپنی جوانی سے لے کر اب تک بہت سے ریسرچ کی ہیں۔ان ریسرچ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اپنے سٹوڈنٹس کو بھی سکھایا ہے۔ریسرچ کرتے وقت میں نے اسلام کو بھی سٹڈی کیا ہے۔ان ریسرچ سے جو سب سے اہم بات میں نے سیکھی ہے۔وہ ہے پیورٹی آف ہارٹ۔دل کی صفائی۔"

انگریز پروفیسر کا ٹاپک بہت اہم تھا۔وہ انگریز اسلام کی بات کر رہا تھا۔نور بی بی کو اس کی باتیں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔

"دل کی صفائی بہت ضروری ہے۔اگر انسان کا دل صاف ہو جائے تو میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں۔کوئی انسان دنیا میں ناکام نہیں ہو سکتا۔دل کی صفائی سے انسان کا اندر باہر ایک ہو

جاتا ہے۔"

وہ اپنے ہر لفظ پر زور دے رہے تھے۔شاید ان کے بولنے کا سٹائل ہی ایسا تھا۔الفاظ سے زیادہ ان کے بازو کام کر رہے تھے۔

"اس دنیا میں سب کو اچھی سے اچھی صاف ستھری چیز چاہیے۔رائٹ۔ چاہیے وہ گھر ہو، کپڑے ہوں، کھانے پینے کی اشیاء ہوں۔یہاں تک کہ ہمیں لائف پارٹنر بھی ایسا چاہیے جو دل کا بہت صاف ہو۔خود ہم چاہیے جیسے مرضی ہوں۔" طنزاً بولے۔

"ابھی ادھر یونیورسٹی آتے وقت میں نے باہر ایک بہت بڑا ایل بورڈ دیکھا۔بل بورڈ پر دودھ کا ڈبہ بنا ہوا تھا۔دودھ کے دبے کو چار پانچ پیکنگ سے گزار کر تیار کیا گیا تھا۔اس کے ساتھ ایک کھلے دودھ کی تصویر تھی۔جس پر مکھیاں بیٹھی تھیں۔ظاہر ہے وہ دودھ گندا تھا۔اوپر لکھا تھا۔خالص دودھ۔پیکنگ والا دودھ آپ کی صحت کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔"

"بالکل صحیح بات ہے۔پیکنگ والی ہر چیز ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہے۔میرے دل میں خیال آیا کہ انسان کو بھی اپنے دل کی صفائی کرنی چاہیے۔اس کے لیے اچھی خوراک بہت ضروری ہے۔جیسے پھل، مچھلی، لہسن، سبز چائے ورزش وغیرہ۔اس سے آپ کا کولیسٹرول کنٹرول میں رہتا ہے۔ہمیں اپنے دل کو پیورفی کرنا چاہیے۔دودھ کی طرح خالص بنانا چاہیے۔دل کی صفائی نہ کی جائے تو انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔دل کی بیماریاں صرف صحت کی خرابی کی وجہ سے نہیں ہوتیں۔اس میں انسان کا ماحول بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔میں یہاں بات رویوں کی کر رہا ہوں۔

جیسے بہت سے لوگ اپنے مستقبل کو لے کر اپنے اندر پریشانی پال لیتے ہیں۔مستقبل کا خوف انہیں گھیر لیتا ہے۔

دوسروں کو کامیاب دیکھ کر دل میں جیلس ہوتے ہیں۔
فضول باتوں کی ٹینشن لے کر بیمار پڑ جاتے ہیں۔
رشتہ داروں کی باتوں کو لے کر دل پر لگا لیتے ہیں۔
ماضی کی باتوں کو اپنے اوپر سوار کر لیتے ہیں۔ان سے وہ نکلتے ہی نہیں۔
اپنی ناکامی کو اپنی قسمت سمجھ کر ہار مان لیتے ہیں۔
اگر زیادہ کمانے لگیں تو بعض لوگ گھمنڈی بن جاتے ہیں۔اپنے اندر غرور کا بیج بو لیتے ہیں۔"

پروفیسر جان ہیری ان پوائنٹس کو اپنی انگلیوں پر گنوار ہے تھے۔نوری بی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ماضی کی بات سن کر ماتھے پر شکن آئی۔

"اس سب کا آسان حل ہے۔اسلام نے اس مسئلہ کا حل بڑی آسانی سے بیان کیا ہے۔ اگر تمام مسلمان اس پر عمل کرتے تو آج سب سے کامیاب قوم ہوتی۔دل کو صاف کرنے کا بہترین طریقہ درود شریف پڑھنا اور ہر وقت استغفار کرنا ہے۔"

انگریز پروفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب دنگ رہ گئے۔پورے آڈیٹوریم میں سیٹیاں اور تالیاں بجنے لگیں۔سب سے پچھلی صف میں بیٹھی نوری بی کے چہرے کے رنگ بدل گئے۔اپنے دونوں پاؤں زمین پر لٹکا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"درود شریف اور استغفار۔" زبان سے بے ساختہ نکلا۔اسے پروفیسر حلیمہ کی باتیں یاد آئیں۔

"جب آپ درود شریف پڑھو گے استغفار کرو گے۔تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا۔آپ کے اندر سے دنیا کی محبت ختم ہوتی جائے گی۔آپ کا اللہ پر بھروسہ اور مضبوط ہو گا۔ آپ فضول قسم کی ٹینشنوں سے آزاد ہو جائیں گے۔

آپ سب ابھی سٹوڈنٹس ہیں۔آپ کی پوری زندگی آپ کے آگے پڑی ہے۔آپ سب مسلمان ہو۔اپنے فیوچر کی فکر چھوڑ دو۔اپنے دل کو صاف کرواسے پیورفی بناؤ۔درودشریف پڑھو، استغفار کثرت سے کرو۔پانچ وقت کی نماز پڑھو۔اس سے آپ کی زندگی میں ایک بیلنس پیدا ہوگا۔

میں ابھی بھی سلام کو پڑھ رہا ہوں۔اس پر اپنی ریسرچ کر رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا گہرا سمندر ہے۔جو بے تحاشا خزانوں سے بھرا ہوا ہے۔ماڈرن سائنس بھی اس کے آگے فیل ہے۔آخر میں یہ کہنا چاہوں گا۔اللہ آپ سب کو ترقی دے۔اپنے فیوچر کو غلط راہ پر چل کر تباہ مت کرنا۔دوسروں کے لیے آسانی پیدا کریں۔وہ ذات جس کی رحمت ہر جگہ موجود ہے۔وہ آپ کے لیے آسانی پیدا کرے گی۔"

وہ اپنی نشست جا کر بیٹھ گئے۔تمام سٹوڈنٹس نے ان کے لیے اٹھ کر تالیاں بجائیں۔نور بی بی آڈیٹوریم سے باہر آ گئی۔وہ سامنے گراؤنڈ میں گھاس پر بیٹھ گئی۔آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔دوپہر کا وقت تھا۔نیلے رنگ کے آسمان پر سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔

"تو دل کو صاف کرنا ہے۔ماضی کی تلخ یادوں سے نکلنا ہے۔"

نور نے اپنی دائیں طرف دیکھا۔پروفیسر حلیمہ برقع پہنے کھڑی تھیں۔وہ بھی اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"خالی ہاتھ نہیں لوٹو گی۔اپنا ایک قدم اس کی طرف بڑھاؤ۔وہ تمہیں تھام لے گا۔"

"میڈم میری خوشیاں چھن گئی ہیں۔میرا فیوچر تباہ ہو گیا ہے۔میرا وقت واپس نہیں لوٹ سکتا۔اللہ سے رو رو کر کتنی دعائیں مانگی تھیں۔تب اس نے میری ایک دعا بھی قبول نہیں کی۔تو اب وہ میری دعا کیوں سنے گا۔ایک خواہش کی تھی۔وہ بھی پوری نہیں کی میں نے ایسا کیا کر دیا

تھا۔" گھاس سے سوکھا پتہ توڑ کر اسے اپنے ہاتھ میں کچل دیا۔

"ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو ضرور آزماتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سگے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو بارہ سال قید میں رہنا پڑا۔ ان کو اپنے والد محترم سے بچھڑے ہوئے چالیس سال ہو چکے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام چالیس سال تک اپنے بیٹے کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ پر کیا ہوا جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ تب وہ مصر کے بادشاہ بن چکے تھے۔ وہ پیغمبر تھے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی میں مشکلات دیکھی تھیں۔ ان کی چالیس سال بعد جا کر دعا قبول ہوئی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ یہ باتیں ہم تک اس لیے پہنچی ہیں ہم کم از کم ان باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ نور، کیا تمہارے دکھ اس کائنات سے بڑے ہیں؟"

"نہیں اتنے بڑے نہیں ہیں۔ شاید اللہ کے ہاں ایک گندم دانے کے برابر بھی نہ ہوں۔" اپنے کندھے اچکائے۔

"بس پھر اللہ پر کامل یقین رکھو۔ یاد رکھنا مشکل کے بعد آسانی ہے۔ وہ سب ٹھیک کر دے گا۔" وہ کھڑی ہوئیں تو نور بی بی اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"پہلے ہم برگر کھائیں گے۔ پھر کچھ شاپنگ کرنے چلیں گے۔"

"میں آپ کے ساتھ۔ شاپنگ۔" وہ ہچکچائی۔

"کیوں؟ میرے ساتھ کیوں نہیں۔ ابھی میرا یہاں کوئی دوست نہیں سوائے تمہارے۔ شام سے پہلے واپس آجائیں گے۔ تمہاری ہاف چھٹی میں لے لیتی ہوں۔" پروفیسر حلیمہ

آفس میں چلی گئیں۔نوری بی ان کو انکار نہیں کر سکی۔اتنے سالوں میں نور کی بھی وہی دوست بنی تھیں۔وہ اپنی گاڑی لے کر آئیں نوری بی کو زبردستی ساتھ بٹھا کر لے گئیں۔

گاڑی ایک برگر شاپ کے باہر رکی۔پروفیسر حلیمہ نے دو برگرز کا آرڈر دیا۔وہ کئی سالوں بعد یونیورسٹی سے نکلی تھی۔گاڑی میں اپنا چہرہ ڈھانپ کر بیٹھی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔برگر کھانے کے بعد وہ ایک شاپنگ مال پہنچے۔

پروفیسر حلیمہ نے اپنے لیے کچھ شاپنگ کی۔نوری بی کو ایک سوٹ گفٹ کیا۔وہ اس کے لیے شوز کی شاپ پر جوتے پسند کر رہی تھیں۔نوری بی اپنا سائز دیکھ رہی تھی۔ایک جانی پہچانی آواز سے اس کے کان کھڑے ہوئے۔فوراً اپنے دوپٹہ اپنے چہرے پر نقاب کیا۔

ایک کپل اپنی بیٹی کے لیے سینڈل پسند کر رہا تھا۔شاید انہیں کوئی جوتا پسند نہیں آیا۔اور وہ اس شاپ سے چلے گئے۔ماضی کا ایک پل پھر اس کے سامنے آ گیا۔

''چلیں بہت دیر ہو رہی ہے۔مجھے بہت کام ہے۔''وہ کھڑی ہو گئی۔بیگز پکڑے اور شاپ سے نکل گئی۔پروفیسر حلیمہ کچھ کہے بغیر شاپ سے باہر اس کے پیچھے آ گئیں۔سارا راستہ وہ خاموش رہی۔اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں ملتی رہی۔

شام ہو چکی تھی۔اپنے کوارٹر میں آئی۔فریش ہوئی،کپڑے بدلے اور آرام کرنے کے لیے چارپائی پر لیٹ گئی۔دل بہت اداس تھا۔اذان کی آواز سنائی دی۔

''اللہ تعالیٰ تمہاری تمام مشکلیں اور تکلیفیں دور کر دے گا۔وہ غفور ہے، رحیم ہے، کریم ہے، ہر چیز پر قادر ہے۔''پروفیسر حلیمہ کی بات یاد آئی۔اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھنے جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

آج کئی سالوں بعد جا کر نماز کے بعد دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے۔گال آنسو سے بھر

گئے۔ اللہ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ وہ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا دیتا ہے۔ جس سے انسان صراط مستقیم کی راہ پر چل پڑتا ہے۔

☆......☆......☆

اس کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ گھر والے تو کیا اس کی زندگی نے جیسے اس سے منہ موڑ لیا ہو۔ کل تک اپنے گھر میں سکون سے بیٹھی تھی۔ آج زندگی کی چکی میں پس رہی تھی۔

ستارہ اپنے بابا کے پاس ہسپتال میں بیٹھی تھی۔ وہ آئی سی یو میں لیٹے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اس کی شادی کو ابھی چار دن ہوئے تھے۔ اس کے گلے اور چہرے پر زخموں کے نشانات تازہ تھے۔

آنٹی خدیجہ چپ کا روزہ رکھ کر بیٹھی تھیں۔ وہ آئی سی یو کے باہر تھیں۔ حسن نے کئی بار انہیں اندر بلایا پر وہ باہر ہی بیٹھی رہیں۔

سلیم بھائی نے دو تین بار آئی سی یو کے چکر لگائے۔ پر ایک بار بھی ستارہ کی طرف نہیں دیکھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ الٹا وہ اس کو ایسا ظاہر کر رہا تھا۔ یہ سب تمہاری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم ہی اس کی ذمہ دار ہو۔

اس ہی شام حاجی اکرام کا انتقال ہو گیا۔ اگلے دن صبح انہیں دفنا دیا گیا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے اسد اکرام پاکستان نہ آ سکے۔ جنازے کے فوراً بعد ستارہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اسے عینی نے بہت روکنے کی کوشش کی۔ اس کی ماں کو اس کی ضرورت ہے۔ پر وہ اس گھر میں ایک پل بھی اور نہیں رکی۔

”تم اپنا بندوبست جتنا جلدی ہو سکے کہیں اور کر لو۔ بس یہ سمجھو تم چند دن کی مہمان ہو۔“

”مطلب۔ میں سمجھی نہیں۔“ کٹے ہوئے پیاز گرم تیل میں ڈالے۔

''اب تم اتنی بھی بھولی نہیں۔ یہ سمجھ نہ پاؤ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔'' بڑی جیٹھانی اپنے بچے کو گود میں لیے کچن میں داخل ہوئیں۔ ''تمہارا دولہا میرا مطلب ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہے۔'' فریج سے دودھ نکالا۔

ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ شلجم کو باؤل میں ڈال کر زمین پر بیٹھ کر انہیں کاٹنے لگی۔

''مجھے حیرت ہوئی کہ تمہارا بھائی سب کو کچھ جانتے ہوئے شادی کے لیے کیسے مان گیا۔ بس یہ جائیداد جتنی اچھی چیز ہے اتنی بری بھی۔ یہ خوشیاں بھی لاتی ہے اور دکھ بھی۔ لوگ تو اس جائیداد کے پیچھے اپنوں کا خون بھی کر دیتے ہیں۔'' دودھ کو چولہے پر گرم ہونے کے لیے رکھا۔

''جائیداد۔ کون سی جائیداد۔ کس کا خون۔'' شلجم چھیلتے ہوئے نظر اٹھا کر اپنی جیٹھانی کی طرف دیکھا۔

''تمہارا خون اور کس کا۔'' وہ رازداری سے بولی۔

''مطلب۔'' ہڑبڑاہٹ میں چھری اس کے انگوٹھے پر لگی۔ خون کا فوارہ نکل آیا۔ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس کی شرٹ خون سے بھر گئی۔ جیٹھانی نے اپنے بچے کو گود سے اتارا۔ اپنے کمرے سے اپنے شوہر کا رومال لا کر اس کے انگوٹھے پر باندھا۔

''دیکھ کر کام کرنا تھا۔ اگر ساس کو پتا چل گیا تو وہ پورا گھر سر پر اٹھا لیں گی۔ ان کی ہے تو مٹھائی کی دکان پر کسی قصائی سے کم نہیں ہیں۔ زیادہ درد تو نہیں ہو رہا۔''

''نہیں ہو رہا۔ بس ذرا سی چبھن ہوئی تھی۔''

حاجی اکرام کو فوت ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا۔ تب سے وہ اپنے میکے نہیں گئی تھی۔ وہ پہلے سے اتنی تکلیف میں تھی۔ انگلی کا کٹ اس کو محسوس ہی نہیں ہوا۔ سارا دن گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ اس کا شوہر شادی کی رات سے اب تک گھر نہیں آیا تھا۔

جیٹھانی بھی زمین پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ان کی ساس گھر پر نہیں تھی۔ ''تمہارے ابو کی اپنی برتنوں کی دکان ہے۔ملتان میں ان کی زمین ہے۔جس گھر میں رہ رہے ہو وہ کافی بڑا ہے۔تمہارا بڑا بھائی امریکہ میں ہے۔ڈاکٹر بن رہا ہے۔ایسا ہی ہے ناں۔''

''آپ کو یہ سب کیسے پتا۔'' وہ حیران ہوئی ،اس چھری کو دھو یا دوبارہ شلجم کاٹنے بیٹھ گئی۔

''تمہارے بھائی سلیم سے اور کس سے۔اس نے تمہاری شادی ادھر کر دی تا کہ تمہیں جائیداد سے حصہ نہ دینا پڑ جائے۔اور ان لوگوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ان کے بیٹے کا پردہ رہ گیا۔ اور سچ پوچھو تو انہیں مفت میں ایک کام والی مل گئی۔سلیم اور اس کی بیگم حساب لگا کر بیٹھے ہیں۔ بڑا بھائی ڈاکٹر بننے کے بعد ادھر ہی سیٹل ہو جائے گا۔چھوٹا بھائی کرکٹر بن جائے گا۔ان دونوں کی لائف سیٹ ہے۔تو ساری جائیداد کس کی۔سلیم اور سندس کی۔'' اس نے گہری سانس لی۔ایک نیوز رپورٹر کی طرح خبر دی۔ ''بس مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے۔تمہاری ماں نے اس شادی کے لیے کیسے ہاں کہہ دی۔''

ستارہ پھر سے خاموش ہو گئی۔کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔اس کا اصل مجرم تو خود اس کا بھائی تھا۔کسی اور کو قصوروار ٹھہرانے کا کیا فائدہ۔شلجم کو کاٹنے کے بعد انہیں دھونے لگی۔جیٹھانی نے گرم دودھ فیڈر میں ڈالا۔

''ایک بات کہوں۔میں سندس کے بڑے بھائی کی پہلی بیگم ہوں۔میرے میکے والے بہت امیر ہیں۔جلد ہی اس گھر سے اپنے بچوں کے ساتھ شفٹ ہو رہی ہوں۔انہوں نے زبردستی میرے شوہر کی دوسری شادی کروائی ہے۔مجھے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔اگر تمہارا شوہر تمہیں طلاق دے دے تو اپنے گھر چلی جانا۔ابھی تمہاری زیادہ عمر نہیں ہے۔یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔اپنی ساری زندگی یہاں مت گزار

دینا۔تمہارے جسم پر زخم کے نشان اب بھی ہیں۔'' نگینہ رانا واپس گھر آ گئی۔وہ دودھ لے کر کچن سے چلی گئیں۔

ان کٹے ہوئے شلجموں کو دیگچی میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔اپنے کمرے میں آئی۔اس کا شوہر پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔الماری سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ستارہ کے پیر ادھر جم گئے۔

''کچھ چاہیے؟'' اس نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

''تمہیں ایک بار بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر مارا۔وہ دروازے سے ٹکرائی۔''آئندہ مجھ سے کوئی بات مت کرنا۔''

تھپڑ کی آواز سن کر ساس فوراً کمرے میں آدھمکی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ اونچی آواز میں چلائی۔''ابھی ابھی میرا بیٹا گھر آیا ہے۔کیوں اسے پریشان کر رہی ہو۔''

''اس کو کہہ دیں یہاں سے چلی جائے۔'' وہ اپنا سامان لے کر کمرے سے نکل گیا۔

''کیا ہوا اگر شوہر نے ایک لگا دی۔آدمی تو غصہ کرتے ہیں۔''

''آدمی کرتے ہیں نامرد نہیں۔'' اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔

''کیا کہا تم نے؟'' اس کے یہ الفاظ نگینہ رانا پر بجلی کی طرح گرے۔اسے امید نہیں تھی۔وہ اس کے آگے کبھی بولے گی۔غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔اس کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔اس کے منہ پر دو چار تھپڑ لگائے۔''آئندہ میرے بیٹے کو کچھ کہا پھر دیکھنا میں تیرا کیا حشر کروں گی۔''

ستارہ صوفے پر بیٹھی اپنے زخم سینک رہی تھی۔اتنا کچھ ہونے کے باوجود آج اس کا ایک آنسو بھی نہ نکلا۔اس کا شوہر دوبارہ بیگ لے کر کمرے میں آیا۔شاید کہیں جا رہا تھا۔

''کیا میں آگے پڑھ سکتی ہوں۔ میرے پیپرز ہونے والے ہیں۔'' اپنے انگوٹھے سے رومال اتارا۔ وہ ٹرانس بیٹھی تھی۔

''اپنی ساس سے پوچھو۔'' الماری سے کپڑے نکال کر بیگ میں ڈالے۔ ''مجھے اپنی شکل مت دکھایا کرو۔''

اس نے اپنے بیگ میں کپڑے ڈالے۔ اپنا کچھ ضرورت کا سامان لیا اور گھر سے نکل گیا۔

''وہ تو مجھے کبھی پڑھنے نہیں دیں گی۔ کیا میری پڑھائی ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی۔ کیا میں کبھی یونیورسٹی کی ڈین نہیں بن پاؤں گی۔''

دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ ایسا کوئی نہ تھا جو اس کی تکلیف پر مرہم رکھتا۔ اپنے زخمی انگوٹھے کو زور سے دبایا۔ پورا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ خون کی چند بوندیں زمین پر گریں۔

''سندس آرہی ہے۔ اس کے لیے کباب بنا کر تل دو۔ ساتھ میں کچھ میٹھا بنا دو۔'' نگینہ رانا اپنی زہریلی آواز سے حکم دے کر چلی گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ستارہ کو نوچ کھائے۔

اس کی شادی کو چند ماہ گزر گئے۔ وہ ایک بار بھی اپنے میکے واپس نہیں گئی۔ نہ ہی آنٹی خدیجہ اس سے ملنے آئیں۔ اس دوران بورڈ کے پیپرز بھی گزر گئے۔ اس کی رول نمبر سلپ سندس نے پھاڑ کر پھینک دی۔ ان چند ماہ میں وہ بہت بدل گئی۔ گھر واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ سسرال کے ظلم وستم چپ رہ کر برداشت کر رہی تھی۔

نگینہ رانا روز کہیں گھومنے چلی جاتی۔ بڑے بھائی کی پہلی بیگم علیحدہ گھر میں شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کی سوتن جاب کر رہی تھی۔ وہ بھی صبح جاتی، شام کو واپس آتی۔

چھوٹی جیٹھانی سارا دن بستر پر گزارتی۔ اس کا شوہر اس کی خدمت کرتا۔ زن مرید۔ نگینہ رانا کو یہ سب کہاں برداشت تھا۔ پر اپنے بیٹے کو کچھ کہہ بھی نہیں پاتی۔ اس کی بیگم جو اپنی ساس

کو کھری کھری سنا دیتی۔ وہ کہتے ہیں نہ ایک لاٹھی اللہ کی بھی ہوتی ہے۔

ستارہ سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ ہر دوسرے دن سندس ادھر ہی سے کھانا کھاتی۔ اس کی فرمائش پر کھانا پکتا۔ وہ اپنے میکے ایسے آتی جیسے کوئی مہارانی ہو۔ سلیم بھی اکثر ساتھ ہوتا۔ پر دونوں بہن بھائی کا کبھی آمنا سامنا نہ ہوتا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ ستارہ چھت پر کھڑی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا حلیہ کام والی جیسا تھا۔ کالے رنگ کی شلوار کے اوپر گندمی رنگ کی پرانی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کا جوڑا کر کے تیل لگایا ہوا تھا۔ مشین خراب تھی۔ سارے کپڑے ہاتھ سے دھوئے تھے۔ خود بھی ساری بھیگی ہوئی تھی۔ گیلے کپڑے تار پر خشک ہونے کے لیے ڈال رہی تھی۔ سندس بھنے چنے کھاتی چھت پر آ پہنچی۔

''تمہیں کچھ بتانا تھا۔ شاید تم کو کچھ عجیب لگے۔'' ایک چنا منہ میں اچھالا۔ ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالٹی سے کپڑے نکال کر نچوڑے۔

''وہ تمہاری سہیلی تھی ناں۔ ارے وہ عینی اس نے خودکشی کر لی ہے۔ پرسوں رات اس کو دفنا دیا۔ اس کی ماں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہیں۔'' گیلے کپڑے بالٹی میں واپس پٹخ دیئے۔ زور سے پٹخنے کی وجہ سے بالٹی الٹ گئی۔ بالٹی کا سارا پانی بہہ گیا۔

''ارے دیکھ کے میرے نئے جوتے گیلے کر دیے۔'' وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ ''اور میں کیوں بکواس کروں گی۔ خودکشی کر کے مر گئی ہے۔'' اسے اپنے نئے جوتوں کی فکر پڑ گئی۔

''آپ سچ کہہ رہی ہیں۔''

''ارے جا کر اس کی ماں سے پوچھ لے۔ رو رو کر برا حال کر لیا ہے اپنا۔''

"عینی نے خودکشی کر لی۔نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی نیچے کو بھاگی۔ اپنے کمرے سے چادر لی اور گھر سے روانہ ہوئی۔سندس پیچھے سے آواز دیتی رہ گئی۔

گلی سے آٹو رکشہ مل گیا اس میں بیٹھی۔سارا راستہ روتی رہی۔دل میں دعائیں مانگتی رہی کہ سب جھوٹ ہو۔وہ سیدھا آنٹی ہاجرہ کے گھر پہنچی۔آٹو رکشہ ان کے گھر کے باہر رکا۔ اترتے ہی دروازہ پیٹنے لگی۔دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔

"یا اللہ! سب جھوٹ ہو۔یا اللہ! سب جھوٹ ہو۔" سر پر چادر اوڑھی تھی۔کپڑے گیلے تھے۔

زینی آپی نے دروازہ کھولا۔ان کا چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گئی۔چکرآئے ادھر گرنے والی تھی۔ زینی آپی نے اسے سنبھالا،اسے پکڑ کر اندر لے کر گئیں۔اسے چارپائی پر بٹھایا۔آٹو والے کو انہوں نے کرایہ دیا۔ستارہ کو محلے کی آنٹی نے پانی پلایا۔اسے کچھ ہوش آیا۔

"عینی نے خودکشی کر لی ستارہ۔میری چھوٹی بہن اس دنیا میں نہیں رہی۔"

"کب۔کب ہوا یہ سب؟" وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔"کیوں کیا اس نے ایسا۔"

زینی آپی بھی اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ان کا خود برا حال تھا۔

"پتہ نہیں ستارہ۔ہم خود یقین نہیں کر پا رہے۔وہ سکول سے آئی،امی کے ساتھ کھانا کھایا اور کمرے میں چلی گئی۔امی دکان پر سبزی لینے گئیں۔جب امی واپس آئیں،عینی نے پنکھے سے لٹک کر خودخوشی کر لی تھی۔" ان کے آنسو رک ہی نہیں رہے تھے۔

"آنٹی کہاں ہیں۔" وہ اب بھی شاک میں تھی۔

"وہ دوا کھا کر سو رہی ہیں۔ان کی حالت کافی خراب ہے۔پولیس والے لگاتار پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ابھی سب کو یہی لگ رہا ہے۔رزلٹ آنے والا ہے اس لیے خودکشی کی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا بچے ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔" محلے کی آنٹی نے بتایا۔

شام تک ستارہ ان کے گھر رہی۔آنٹی سے بھی ملاقات ہوئی۔ان کا بیچ میں برا حال تھا۔ وہ ستارہ کے گلے لگ کر بہت روئیں۔اس کے پاس خود کوئی الفاظ نہیں تھے۔جس سے وہ آنٹی کو تسلی دیتی۔

رات کو زینی آپی نے زبردستی دونوں کو کھانا کھلایا۔آنٹی ہاجرہ کو دوبارہ دوا کھلا کر سلا دیا۔ ستارہ اور زینی دونوں رات کو صحن میں چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھیں۔صحن میں اندھیرا تھا۔ ساتھ والوں کے صحن کے بلب کی روشنی ان کے گھر آ رہی تھی۔

’’اگر تم آج رات یہاں رک جاؤ۔تو میں ذرا اپنے سسرال ہو آؤں۔مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی۔عینی ابھی بچی تھی۔لوگ کیوں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔‘‘

’’طرح طرح کی باتیں۔مطلب۔‘‘

’’اب میں کیا بولوں۔تمہارا نام بیچ میں آ رہا ہے۔‘‘ان کا لہجہ کچھ بدلا۔

’’کیا۔میرا نام؟‘‘

’’کیا تمہارا کسی سے افیئر تھا؟ تبھی تمہارے گھر والوں نے یوں راتوں رات تمہاری شادی کر دی۔‘‘زینی آپی غصے سے بولیں۔

وہ خاموش ہو گئی۔شاید کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

’’اس خاموشی کا میں کیا مطلب سمجھوں۔دیکھو میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ عینی نے تمہاری وجہ سے خودکشی کی ہے۔پر محلے والے یہی کہہ رہے ہیں۔شاید عینی کا بھی کوئی چکر ہو۔اس لیے اس نے۔‘‘گہری سانس لی۔’’پلیز آج رات ادھر رک جاؤ۔میں صبح چکر لگاؤں گی۔‘‘وہ اندر گئیں،چادر اوڑھی،اپنا بیگ لیا اور باہر آئیں۔

’’ایک بات پوچھوں؟‘‘اس کا حلق خشک تھا۔

"کیا؟ پوچھو۔" وہ گیٹ پر رکیں۔
"آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟"
"تمہاری سندس بھابھی نے اور کس نے۔" اپنی پلکیں اٹھائیں، گیٹ کھولا اور باہر نکل گئیں۔ باہر دانش کھڑا تھا۔ بائیک سٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر آواز مدہم ہوگئی۔
گیٹ کو لاک لگایا۔ بنا آواز کیے اندر کمرے میں جا کر جھانکا۔ آنٹی سو رہی تھیں۔ دوسرے کمرے کی لائٹ آن کی۔ عینی سے آخری ملاقات اس ہی کمرے میں ہوئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔
"وہ اکثر باتوں میں کہتی تھی۔ میں نے مر جانا ہے۔ بہت جی لیا میں نے۔ میں اس کی باتیں مذاق میں اڑا دیتی تھی۔"
"کاش میں اس کی باتوں کو سیریس لیتی۔ اس سے پوچھتی اسے کیا پریشانی ہے۔ اب سب اس کی موت کا مجھے ہی ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں۔ میرا کسی سے چکر تھا۔ میرے ساتھ جو ہوا وہ ایک طرف، پر عینی۔"
اس نے بیڈ شیٹ کو اپنی انگلیوں سے جکڑ لیا۔ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے دوپٹہ کو اپنے منہ میں ٹھونسا۔ دل کر رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اس رات وہ بہت روئی۔ اتنا تو تب نہیں رہی جب انکل حاجی فوت ہوئے تھے۔ جب سسرال سے اتنا ظلم سہہ رہی تھی۔ پر آج دل کھول کر روئی۔
اس بیڈ پر اکٹھی ہو کر لیٹ گئی۔ عینی اس کی ایک ہی دوست تھی۔ اس ہی بیڈ پر اکٹھے مل کر سکول کا کام کرتے۔ آنٹی سے چھپ کر فلموں کے گانے گاتے۔ آج وہ نہیں رہی وہ سچ میں تنہا ہوگئی ہے۔ ساری رات یوں ہی روتی رہی۔ نا جانے کب نیند آئی وہ ادھر ہی سو گئی۔

صبح جب آنکھ کھلی، آنٹی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا۔ اس نے ساری رات رو کر گزاری ہے۔

"حسن آیا تھا۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔ تم اپنے سسرال بتا کر نہیں آئی۔" ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ سالوں کی بیمار لگ رہی تھیں۔

ستارہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ نظریں چرالیں۔

"آنٹی! ایک بات پوچھوں۔ عینی۔" ہمت نہیں ہوئی آگے بولنے کی۔

"مجھے نہیں پتا عینی کو کیا ہوا تھا۔ اس نے یہ قدم کیوں اٹھالیا میری بچی۔" وہ پھر سے رونے لگیں۔ "محلے والے میری بیٹی کے بارے میں باتیں بنا رہے ہیں۔"

ان کے یہ الفاظ ستارہ کے دل پر تیر کی طرح لگے۔ وہ ان کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

"میرا اللہ سچ جانتا ہے۔ میری بیٹی نے کچھ نہیں کیا۔ تم نے بھی کچھ نہیں کیا۔ شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔"

"آنٹی۔"

"مجھے عینی نے بتایا تھا۔ تم نے خط لکھا تھا جو تمہارے بھائی نے پکڑ لیا۔ اور اس ہی وجہ سے تمہاری شادی کردی۔" دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے۔

ستارہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔ زمین پھٹ جائے وہ اس میں دفن ہو جائے۔ وہ بت بنی بیٹھی رہی۔

"بڑی حیرت ہوتی ہے تمہارے بھائی پر۔ اپنی بیگم کے کہنے پر اس نے تمہیں اندھے کنویں میں پھینک دیا۔ ایک خط تو لکھا تھا۔ بڑا بھائی تھا ڈانٹ کر سمجھا دیتا۔"

ستارہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی رو پڑی۔ کاش اس کی ماں اسے سینے سے لگاتیں۔

اس کا ساتھ دیتیں اس کی شادی نہ ہونے دیتیں۔

''کیا وہ تمہیں روز مارتا ہے۔میں اندھی نہیں ہوں تمہارے جسم پر نشانات صاف نظر آ رہے ہیں۔مرد کا اگر ہاتھ اٹھ جائے وہ ساری زندگی ہاتھ اٹھاتا ہے۔''اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔''ابھی بھی وقت ہے اس دلدل سے باہر نکل آؤ۔میں نے اپنی ایک بیٹی کھوئی ہے۔ دوسری بیٹی کو کھونے کی ہمت نہیں ہے۔''

''وہ۔۔وہ۔۔۔بہت عجیب ہے۔۔کہتا ہے۔مجھے مرد اچھے۔لگتے ہیں۔میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔کہتا ہے مجھے طلاق دے دے گا۔''ہچکیاں لے کر بولی۔

آنٹی کا حیرت سے منہ کھل گیا۔''تمہاری ماں کو یہ سب معلوم ہے۔''

''میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔پر بھائی کو سب معلوم تھا۔''

''تم چند دن میرے گھر رک جاؤ۔جس طرح تمہارے گھر والوں نے تمہاری شادی کر دی ہے۔اس سے تمہارے گھر والوں کو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔''انہوں نے اس کے سر پر پیار کیا۔

ستارہ آنٹی کے ساتھ مل کر شام کا کھانا تیار کر رہی تھی۔آنٹی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ستارہ پاس بیٹھی گھٹنوں پر سر دیے اپنی سوچوں میں گم تھی۔''کیا وہ مجھے طلاق دے گا۔اور فرض کروا گر دے بھی دی تو طلاق کے بعد میں کیا کروں گی۔سب کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہوگا۔رشتے دار، محلے والے سب کیا سوچیں گے۔''

گیٹ پر بیل بجی۔ستارہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔سندس اپنی ماں کے ساتھ وہاں ٹپک پڑی۔اندر آتے ہی شور مچا دیا۔

''تمہیں شرم نہیں آئی بغیر بتائے ساری رات گھر سے باہر رہی۔وہ بھی اجنبیوں کے گھر۔ کچھ شرم لحاظ باقی ہے۔اگر تمہارے شوہر کو پتا۔''

"کون سا شوہر، جسے مرد اچھے لگتے ہیں۔" آنٹی نے ان کی بات کاٹ دی۔
سندس اپنی ماں کے ساتھ گیٹ پر کھڑی تھی۔ ستارہ صحن میں تھی۔ آنٹی برآمدے میں کھڑی تھیں۔ نگینہ نے نفرت اور کھا جانے والی نظروں سے اپنی بہو کو دیکھا۔ کیا ضرورت تھی سچ بتانے کی۔
"یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔ اپنی بیٹی کو سنبھال نہ پائیں اور چلی ہیں ہم پر مسلط ہونے۔ چلو ہمارے ساتھ۔" سندس نے ستارہ کا ہاتھ پکڑا۔
آنٹی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ستارہ کو اپنے پیچھے کیا۔
"وہ کہیں نہیں جائے گی۔ یہ رشتہ ختم سمجھو۔"
"وہ میری بہو ہے۔ تم کون ہوتی ہو بیچ میں بولنے والی۔ ستارہ چل ورنہ یاد رکھنا کیا حشر کروں گی تیرا۔"
"ستارہ! سوچ لو۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ بعد میں تمہارا کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ اس رشتے کا کوئی فیوچر نہیں۔ ان کی خدمت کرنے میں ساری زندگی گزر جائے گی۔"
"مجھے آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جانا۔ اپنے بیٹے سے کہنا مجھے طلاق بھیج دے۔ ورنہ میں پولیس سٹیشن جا کر آپ لوگوں کے خلاف کمپلینٹ کر دوں گی۔" وہ شیرنی کی طرح دھاڑی۔
نگینہ رانا نے ان کے صحن میں کھڑے ہو کر خوب تماشا لگایا۔ سندس بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ وہ دونوں لڑ کر چلی گئیں۔ ستارہ پہلی بار مطمئن تھی وہ اچھے سے جانتی تھی۔ وہ سلیم کو بھڑکائے گی۔ وہ ماں کو بلیک میل کرے گا۔ پر وہ اور نہیں سہنا چاہتی۔ اس رشتے کا واقعی کوئی فیوچر نہیں۔ اور رہا سلیم اس نے صرف اپنے بارے میں سوچا اور اس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

''تم اندر چلو۔تمہاری ماں سے میں بات کرتی ہوں۔ایک نمبر کے جاہل لوگ ہیں۔ تمہاری ماں کی عقل پر لگتا ہے پتھر پڑ گئے تھے۔جو تمہاری شادی ایسے لوگوں میں کردی۔''

وہ آنے والے طوفان کے لیے تیار تھی۔رات کو دونوں صحن میں بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں۔

''تم نے اپنا کیا حلیہ بنایا ہوا ہے۔اپنے کپڑے بھی ساتھ نہیں لائی۔ایسا کروں عینی کے کپڑے پہن لو۔''ان کی آنکھیں پھر نم ہوگئیں۔

''مجھے یقین نہیں آرہا عینی کچھ ایسا کرسکتی ہے۔''روٹی کا لقمہ لیا۔

''کبھی عینی نے تم سے کچھ کہا۔میری بچی کو کیا دکھ تھا۔''

''میں تو خود حیران ہوں۔اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ہمیشہ پڑھائی کی باتیں کرتی تھی۔''آنٹی کو پانی دیا۔

''تم اپنی امی سے کیوں بات نہیں کرتی۔وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔''

''ان کو صرف اپنے بیٹے سے پیار ہے۔تبھی تو مجھے قربان کردیا۔''

''ایسا مت کہو میں ایک ماں ہوں۔مجھ سے پوچھو اولاد کی کیا تکلیف ہوتی ہے۔''وہ پھر رو پڑیں۔

ستارہ ان کی دوا لینے اندر کمرے میں گئی۔گیٹ پر دستک ہوئی۔وہی سب ہوا جو اس نے سوچا تھا۔سلیم اس کو لینے آیا۔پر اس نے جانے سے صاف انکار کردیا۔

''میں اٹھارہ سال سے اوپر ہوں بالغ ہوں۔آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے۔ مجھے طلاق چاہیے ورنہ عدالت جاؤں گی۔''ستارہ دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھے سلیم کے سامنے کھڑی تھی۔سلیم اسے غصے سے گھور رہا تھا۔سندس سلیم کے پیچھے کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

''اور ایک بات مجھے جائیداد میں سے اپنا حصہ چاہیے۔دکان سے، ملتان والی زمین سے، اور

جس گھر میں آپ لوگ رہ رہے ہیں۔" صاف گوئی سے کام لیا۔

جائیداد کا نام سن کر سلیم اور سندس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ پہلی باران کو ہزار واٹ کا گرنٹ لگا۔

"کون سی جائیداد؟ تمہارا کوئی حصہ نہیں بنتا۔" سندس تیر کی طرح آگے بڑھی۔

"بنتا ہے بالکل بنتا ہے۔ جس طرح آپ کا۔" اپنی انگلی سے سندس کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کا اپنے گھر میں اور اس مٹھائی کی دکان میں حصہ بنتا ہے۔ ویسے میرا بھی بنتا ہے۔ اب بابا بیمار تو ہیں نہیں کہ اب آپ مجھے بلیک میل کریں۔"

سلیم کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ آخر اس کے لیے تو اس نے سب کھیل کھیلا تھا۔ وہ وہاں سے چلتا بنا سندس بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔

"آپ دوا کھالیں میں برتن سمیٹ دیتی ہوں۔"

ان کو دوا کھلا کر اندر سونے کے لیے بھیج دیا۔ برتن سمیٹے ان کو دھونے کے بعد کچن صاف کر کے عینی کے کمرے میں آ گئی۔

"طلاق کا تو میں نے کہہ دیا۔ پر اب کیا کروں گی؟ اس گھر میں واپس تو کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ تو پکا ہے۔"

فیصلہ وہ کر چکی تھی۔ اب اس پر قائم رہنا تھا۔ میز پر عینی کی بچپن کی تصویروں کا البم پڑا تھا وہ دیکھنے بیٹھ گئی۔ یہ رات بھی روتے ہوئے گزری۔

اگلے دن صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ فوراً اٹھ کر واش روم میں گھسی۔ فریش ہو کر آئی۔ آنٹی اپنے کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں۔ وہ کچن میں چلی گئی۔

"تم پھر کچن میں لگ گئی۔ کم از کم اپنے کپڑے ہی بدل لو۔ حسن تمہارے کچھ پرانے

کپڑے دے کر گیا ہے۔" وہ کچن کی چوکھٹ میں کھڑی تھیں۔

"آپ میری امی سے بات کر رہی تھیں۔" وہ چونکی، چائے کی پتی ساس پین میں ڈالی۔ وہ جواب دیے بغیر چلی گئیں۔ ستارہ نے چائے بنائی۔ چائے کے دو کپ کے ساتھ رس لے کر صحن میں آئی۔ ایک کپ آنٹی کو دیا۔

"بیٹھو تمہیں کچھ بتانا ہے۔" وہ جیسے الفاظ ڈھونڈ رہی ہوں۔ "تمہارے شوہر۔۔۔"

"کیا ہوا؟" گرم چائے کا کپ ہاتھ میں تھا۔

"اس نے تو پہلے ہی سے طلاق کے کاغذات تیار کر لیے تھے۔ اس پر اپنے دستخط بھی کر دیے تھے۔ تمہارے سسرال والوں نے تم سے یہ بات چھپا کر رکھی۔ بس تمہارے دستخط کرنا باقی ہیں۔"

"اب۔" ابھی اتنی عمر نہ تھی سب سمجھ پاتی۔

"طلاق کے کاغذات سلیم کے پاس ہیں۔ ستارہ میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ پر تم سائن کر دینا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کا طلاق یافتہ ہونا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی اس عمر میں۔ پر اس رشتے کا کوئی فیوچر بھی تو نہیں۔"

آنٹی خدیجہ ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئیں۔ انہوں نے حسن کے ہاتھ اس کے کچھ کپڑے اور ضرورت کا کچھ بھجوا دیا۔ سلیم طلاق کے کاغذات دے گیا۔ ستارہ نے اس ہی دن اس پر اپنے دستخط کر دیے۔

اب وہ عدت میں تھی۔ یہ پورا وقت وہ آنٹی کے گھر رہی۔ زینی آپی کبھی کبھار چکر لگا لیتی۔ اب وہ خود امید سے تھیں۔ آنٹی ہاجرہ نے اسے دوبارہ اپنی پڑھائی شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ بیشک وہ پرائیویٹ پیپر دے دے۔ پر اپنی تعلیم کو مکمل کرے۔

اس نے اپنا خواب بھی تو پورا کرنا تھا۔اس لیے گھر میں ہی تیاری کرنے لگ گئی۔اگلے سال نویں اور دسویں کے پیپر اکٹھے دینے تھے۔وہ کسی ہوسٹل شفٹ ہونا چاہتی تھی۔پر اس ہی دن عینی کا رزلٹ آگیا۔اس نے اپنے سکول میں تیسری پوزیشن لی تھی۔

آنٹی ایک بار پھر بیمار پڑ گئیں۔ستارہ نے انہیں بہت مشکل سے سنبھالا۔اپنا ہوسٹل شفٹ ہونے کا پلان بھی چھوڑ دیا۔

اس نے اپنی نئی زندگی شروع کی۔آنٹی کے ساتھ مل کر گھر پر جام بناتی اور شام کو پڑھتی۔اس کا ٹوٹا خواب ایک بار پھر پورا ہونے جا رہا تھا۔لیکن شاید ابھی اس کی قسمت میں اور تکلیفیں لکھی تھیں۔وہ اس بات سے بھی انجان تھی۔آنٹی خدیجہ اس کے لیے چپکے سے پیسے بھیجتی رہتی تھیں۔

☆......☆......☆

”کب تک سوگ مناؤ گی۔تم تو ویسے بھی علیحدہ ہونے والی تھی۔“ کمرے کی لائٹ آن کی۔

”میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔میں سوچ بھی نہیں سکتی وہ اس حد تک جائے گا۔“

شاہدہ بیگ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں۔چہرہ چھت کی طرف تھا۔

”وہ ایسا ہی تھا۔اب دیکھو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کیسے اس کا غرور اور انا خاک میں ملتے ہیں۔یہ خبر سن کر مجھے خود شاک لگا تھا۔میڈیا والے اب تک اس خبر کی جان نہیں چھوڑ رہے۔“

ثاقب بیگ کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا۔

”مجھے صرف اپنے دونوں بچوں کے مستقبل کی فکر ہے۔میرے بچے اب بھی ڈسٹرب ہیں۔اپنے باپ کی لاش کو یوں دیکھ کر۔“

”آپ میرا مشورہ مان لیں۔بچوں کو لے کر جرمنی چلی جائیں۔ادھر ان کی پڑھائی کا کافی

حرج ہو رہا ہے۔اب آپ ہمت سے کام لیں۔اس طرح زندگی نہیں گزرتی۔" وہ اپنی بہن کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کاش میں اپنی آنکھوں سے اسے سزائے موت ہوتا دیکھ سکوں۔میری زندگی سکون سے گزر جائے گی۔"

"اسے عمر قید تو پکا ہوگی۔یہ میری آپ کو گارنٹی ہے۔زندگی بھر جیل میں تڑپے گا۔" اپنے موبائل پر میسج دیکھا۔"شکیل رضا کا کراچی میں ایک فلیٹ ہے۔اس کے پیپرز شکیل کے آفس میں تھے۔تم اس فلیٹ کے پیپرز مجھے دے دو۔میں اس فلیٹ کو سیل کر کے رقم بچوں کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گا۔"

شاہدہ بیگ کاغذات لینے اپنے شوہر کے آفس چلی گئیں۔وہ اپنے بھائی پر اندھا اعتبار کرتی تھی۔اس سے پہلے بھی ثاقب بیگ اس سے کچھ پراپرٹی کے پیپرز لے چکا تھا۔

شاہدہ بیگ پراپرٹی کے کاغذات کے ساتھ اپنے دو سونے کے کنگن لائیں۔جب سے وہ بیوہ ہوئی تھیں۔انہوں نے اپنی سوشل ایکٹویٹی اور پارٹیز چھوڑ دی تھیں۔ایک گھریلو عورت بن کر رہ گئی تھیں۔

"یہ کنگن بیچ دینا۔مجھے واقعی جرمنی شفٹ ہو جانا چاہیے۔فلیٹ کی رقم سے ڈاکومنٹس تیار کروا دینا۔میں اب مزید اس ملک میں نہیں رہنا چاہتی۔" کنگن اور کاغذات اپنے بھائی کے حوالے کر دیے۔

"ٹھیک ہے میں یہ کام جلد سے جلد کرواتا ہوں۔پر تم بھی اس اندھیری دنیا سے باہر آؤ۔اپنے اوپر توجہ دو۔تمہیں اپنے بچوں کے لیے بھی جینا ہے۔" اسے دلاسہ دیا۔اس کی نظریں ان چمکتے سونے کے کنگن پر جمی تھیں۔"اگلے ہفتے عدالت کی کارروائی ہے۔عدالت اپنا

فیصلہ سنائے گی۔تم دیکھنا اسے عمر قید کی سزا سنائے گی۔شاید عدالت تم سے بھی کچھ سوالات کرے۔''

''مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔اس شخص نے میرے بچوں کے سر سے ان کا باپ چھین لیا ہے۔بس میں چاہتی ہوں عدالت اسے کڑی سے کڑی سزا دے۔''ان کا لہجہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا۔اب میں چلتا ہوں۔''جانے کے لیے کھڑا ہوا۔''وہ لیلیٰ نظر نہیں آ رہی۔کیا اپنے گاؤں چلی گئی ہے۔''اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

''میری بلا سے۔مجھے نہیں معلوم کہاں دفعہ ہوئی ہے۔دوبارہ اس کا ذکر مت کرنا۔نجانے اس نے اس گھر پر کیا جادو کیا تھا۔میرا سارا گھر برباد ہو گیا۔''شاہدہ بیگ کا موڈ آف ہو چکا تھا۔اس نے وہاں سے جانا بہتر سمجھا۔اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا۔

''تم قریبی ہوٹل آ جاؤ۔میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔''موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔

''تم تیار رہو عدالت میں کیا کہنا ہے۔''

''ایک ایک لفظ یاد ہے۔اتنے سالوں بعد موقع ملا ہے۔میں اسے کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتا۔آپ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں۔اس مچھلی کو تڑپا کر مارنا ہے۔''

ثاقب بیگ ہوٹل میں وسیم کے پاس بیٹھا تھا۔وسیم ہمیشہ کی طرح سگریٹ پھونک رہا تھا۔

''بس پھر ٹھیک ہے۔اپنا کام پکا سمجھو۔''ٹیبل پر ہاتھ مارا۔''جیت ہماری ہوگی۔''

دونوں ہوٹل میں بیٹھ کر پلاننگ کرتے رہے۔ثاقب بیگ نے ایک بڑی رقم وسیم کے اکاؤنٹ میں بھیج دی۔اسے اب اپنی بہن کو اس ملک سے باہر ہر صورت بھیجنا تھا کیونکہ کل کو وہ اس کے لیے خطرہ بھی بن سکتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا۔ بھوک کی کمی، روز کی مار، سخت سردی، روزانہ سوالات کی بوچھاڑ۔ ان چند ہفتوں میں اس کی حالت اس پودے کی سی تھی۔ جسے محل سے اٹھا کر کسی گلی میں پھینک دیا ہو۔

''آج تیری عدالت میں پیشی ہے۔ مجھے پوری امید ہے تو واپس نہیں آئے گا۔'' کانسٹیبل اتنے دنوں میں پہلی بار مسکرایا۔

تیمور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گندمی رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ پیروں میں وہی ہسپتال والے چپل تھے۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس کی وکیل مریم آج صبح ہی اس سے مل کر گئی تھی۔ اس نے اسے کوئی خاص امید نہیں دلائی۔

کانسٹیبل اسے لے کر عدالت پہنچا۔ ڈی ایس پی آفتاب پہلے سے ادھر موجود تھا۔ تیمور کمرۂ عدالت کے باہر کھڑا لوگوں کے چہروں کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کوئی اپنا مل جائے۔ پر اسے مایوسی ہوئی۔ وہاں سب اجنبی تھے۔ ہر کوئی اپنی دوڑ میں لگا ہوا تھا۔

اسے کمرۂ عدالت لایا گیا۔ وہ کانسٹیبل کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔ یہ کمرۂ عام عدالتی کمروں جیسا تھا۔ وہی وکیل صاحبہ چشمہ لگائے کیس کی سٹڈی کر رہی تھیں۔ عدالت کی سماعت شروع ہوئی۔ تیمور کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کیا۔

''وکیل صاحبہ! اس کیس میں کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سب ثبوت آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ گواہوں کو پیش کرنا چاہوں گا۔'' وکیل امجد کھڑا ہوا۔

''اجازت ہے۔''

''میں سب سے پہلے تیمور رضا کے دوست وسیم کو کٹہرے میں بلانا چاہوں گا۔''

تیمور چونکا، پہلی بار نظر اٹھا کر عدالتی کمرے میں بیٹھے لوگوں پر ڈالی۔ وسیم طنزیہ مسکراہٹ

لیے کٹہرے میں آیا۔ کرسٹل، ثمن، وسیم، لیلیٰ، روبی ثاقب بیگ، شاہدہ بیگ سب کمرۂ عدالت میں بیٹھے تھے۔

اس کی نظریں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دل ایسا دھڑکا جیسے کسی نے مٹھی میں کر کے نچوڑ دیا ہو۔ سانسوں کی ترتیب اوپر نیچے ہو گئی ہو۔ جسم میں چلتا خون رک گیا ہوا۔ اپنے دونوں ہاتھ کٹہرے پر رکھے۔ ورنہ وہ ادھر گر جاتا۔

"آپ عدالت کو بتائیں گے۔ تیمور ولد شکیل رضا کیسے انسان ہیں۔"

"سر! میں آپ کو بتاؤں۔ مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ جب میں نے میڈیا پر یہ سنا کہ تیمور نے اپنے والد کو قتل کر دیا ہے۔"

"کیوں حیرت نہیں ہوئی؟" وکیل امجد نے سوال کیا۔

"تیمور ایک بار مجھ سے کہہ چکا تھا۔ میرا دل کرتا ہے میں اپنی ماں کا قتل کر دوں۔" اپنے کندھے اچکا کر شانِ بے نیازی سے بولا۔

کمرۂ عدالت میں ہلچل مچ گئی۔ شاہدہ بیگ نے اپنی پلکیں اٹھا کر اپنی سوتیلی اولاد کو دیکھا۔ جو وسیم کو ایسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی اور زبان میں بات کر رہا ہو۔ جج صاحب نے سب کو خاموش کروایا۔

"اور کچھ بتانا چاہیں گے تیمور کے بارے میں۔"

"جب بھی ڈرائیونگ کرتا ہمیشہ سگنل توڑ دیتا۔ آپ چیک کروالیں اسے کتنے چالان ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو بادشاہ تیمور لنگ سمجھتا ہے۔ ایک بار غلط ڈرائیونگ کرتے ہوئے غصے میں آ کر ایک بوڑھے شخص کو پیٹ ڈالا۔"

"ٹھیک ہے آپ واپس جا سکتے ہیں۔ کیا آپ کوئی سوال کرنا چاہیں گی۔" لائیر مریم کی

طرف متوجہ ہوئے۔

"نہیں۔ مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔" مریم نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے میں تیمور کے گھر سالوں سے کام کرنے والی مسز لیلیٰ کو بلانا چاہوں گا۔ سب سے پہلے کرائم سین پر یہی پہنچی تھیں۔"

لیلیٰ لال لپ سٹک لگائے کٹہرے میں آئی۔ تیمور گم صم کھڑا تھا۔

"قتل کی رات جب آپ وہاں پہنچی تو آپ نے سب سے پہلے کیا دیکھا؟"

"میں اس رات اپنا کام ختم کر کے سرونٹ کوارٹر گئی۔ جب اپنا کام ختم کر کے واپس آئی۔ ابھی دروازے پر تھی۔ مجھے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر جب اندر پہنچی تو سر شکیل رضا زمین پر گرے ہوئے تھے۔ ان کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ تیمور پاس کھڑا تھا۔"

"کیا اس کے ہاتھ میں گن تھی؟" لائیر مریم نے سوال کیا۔

"میں نے یہ نہیں دیکھا پر مجھے اتنا معلوم ہے۔ اس وقت گھر پر تیمور اور سر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ گن سر کے پاس زمین پر پڑی ہوئی تھی۔" وہ ایسے بول رہی تھی جیسے اخبار سے خبر پڑھ کر سنا رہی ہو۔

"ظاہری بات ہے گن چھپانے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ اس لیے ادھر پھینک دی۔ جج صاحبہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ جس گن سے گولی چلی تھی۔ اس گن پر تیمور کے انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ گولی تیمور نے چلائی ہے۔" وکیل امجد نے اپنے دلائل دیے۔

جج صاحبہ ایک ایک بات نوٹ کر رہی تھیں۔ ٹائپنگ کی آواز لگاتار آ رہی تھی۔

"کیا شکیل رضا اور تیمور جوان کے بیٹے ہیں۔ کیا ان میں کوئی اختلافات چل رہے

تھے؟"

"وہ تو ہمیشہ سے چلتے آ رہے ہیں۔" لیلیٰ ڈھٹائی سے بولی۔"ابھی شکیل صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا امریکہ جائے۔ پر اپنے بیٹے کی ضد کے آگے انہیں ہار ماننی پڑی۔ وہ تیمور کی وجہ سے کافی پریشان رہتے تھے۔ اور تیمور تو غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔ کئی بار گھر کی چیزیں توڑ چکا ہے۔ آپ گھر کے کسی بھی ملازم سے پوچھ لیں۔"

"آپ واپس جا سکتی ہیں۔ مریم صاحبہ! کیا آپ کو کوئی اور سوال پوچھنا ہے۔"

"نہیں۔ میں نے جو پوچھنا تھا وہ پوچھ لیا۔" وہ اپنی کرسی پر بیٹھی رہیں۔

"جج صاحب! میں اب شکیل رضا کی وائف شاہدہ بیگ کو کٹہرے میں بلانا چاہوں گا۔"

"اجازت ہے۔"

شاہدہ بیگ کٹہرے میں آئیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"آپ کے اپنے شوہر سے کیسے تعلقات تھے؟"

"جیسے میاں بیوی کے ہوتے ہیں۔"

"اور تیمور رضا سے۔ جو آپ کی سوتیلی اولاد ہے۔"

"اگر تیمور کے جاننے والا کوئی بھی۔ کوئی بھی ادھر آ کر یہ گواہی دے دے کہ تیمور رضا اچھا انسان ہے۔ تو میں مان لوں گی تیمور بے قصور ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

"آپ واپس جا سکتی ہیں۔" شاہدہ بیگ اپنی سیٹ پر واپس چلی گئیں۔ وکیل امجد جج صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ "سنا آپ نے یہ ایک ایسا شخص ہے۔ جس سے کوئی خوش نہیں۔ جو غصے کا بہت تیز ہے۔ اس کے فادر بھی اس کی وجہ سے پریشان تھے۔ اور اس نے غصے میں آ کر اپنے باپ کو شوٹ کر دیا۔"

ثبوت کا لفظ سن کر تیمور جو بت بنا کھڑا تھا۔اس کا وجود کانپ گیا۔

"سب ثبوت اور گواہ آپ کے سامنے ہیں۔میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ تیمور کو سخت سزا سنائی جائے۔جج صاحب!میں اس عدالت کو یہ بھی بتاؤں گا۔شکیل رضا ہاشمی اپنی یونیورسٹی سے پیپرز چوری کر کے سٹوڈنٹس کو بیچتے تھے۔اس سے پہلے یونیورسٹی ان کے خلاف کارروائی کرتی وہ اس دنیا سے چلے گئے۔مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔" وکیل امجد اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"کیا آپ کو کوئی سوال پوچھنا ہے۔" جج نے مریم سے پوچھا۔

"نہیں۔مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔"

"تیمور رضا!کیا آپ کو کچھ کہنا ہے۔عدالت آپ کو اجازت دیتی ہے۔آپ اپنے حق کے لیے بول سکتے ہیں۔" جج صاحب نے کٹہرے میں کھڑے تیمور سے پوچھا۔اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔کہنا چاہتا تھا میں بے قصور ہوں۔میں نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔پر وہ خاموش رہا۔

"تمام ثبوتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ عدالت تیمور رضا ولد شکیل رضا کو عمر قید کی سزا سناتی ہے۔تیمور کی عمر کا خیال رکھتے ہوئے اگر وہ اس کیس پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے تو وہ دوبارہ عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔عدالت کی کارروائی ادھر ختم ہوتی ہے۔"

فیصلہ سنا دیا گیا۔سب لوگ کمرۂ عدالت سے باہر نکلنے لگے۔تیمور رضا ادھر ہی کھڑا رہا۔اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔کانسٹیبل اسے کٹہرے سے نیچے لایا۔کمرۂ عدالت خالی ہو گیا۔

کانسٹیبل اس کے دونوں ہاتھوں پر ہتھکڑی لگا کر کمرۂ عدالت سے باہر لایا۔اس کی زنجیر کانسٹبل کے ہاتھ میں پکڑی تھی۔وہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

راہداری سے گزرتے ہوئے اسے ہنسنے اور قہقہوں کی آواز سنائی دی۔مڑ کر دیکھا۔وسیم، کرسٹل، روبی، ثمن سب کھڑے ہنس رہے ہیں۔ان سب کی نظر تیمور پر تھی۔وسیم آگے بڑھا۔

''سگریٹ۔ بڑا شوق تھا نا ہواؤں میں اڑنے کا۔'' سگریٹ کا ڈبہ اس کے آگے کیا۔ کانسٹیبل اس کی زنجیر کھینچ کر آگے بڑھا۔

''اب دیکھتے ہیں جیل میں کون سے برانڈڈ کپڑے ملتے ہیں۔'' کرسٹل طنزیہ ہنسی۔

اسے پولیس وین میں بٹھایا۔ وین کا دروازہ بند کرتے وقت اس کی نظر ثاقب بیگ پر پڑی۔ وہ ڈی ایس پی آفتاب سے باتیں کر رہا تھا۔ دیکھنے سے صاف ظاہر تھا وہ دونوں دوست ہیں۔ ثاقب کے پیچھے لیلیٰ کھڑی تھی۔ جب اس کی نظر تیمور پر پڑی۔ اس نے تیمور کو آنکھ ماری۔ پولیس وین کا دروازہ بند کر دیا۔

''یہ آخری بار تھا۔ جس کو دیکھنا تھا دیکھ لے۔ پھر نہ جانے کب ان کی شکلیں دیکھنے کو ملیں گی۔'' کانسٹیبل اس کے پاس بیٹھ گیا۔

پولیس وین جیل کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد پولیس وین جیل کے باہر رکی۔ کانسٹیبل نے تیمور کو وین سے اتارا اور اسے جیل میں لے گیا۔ وہ خاموش رہا۔ ایک لفظ نہ بولا۔ جیل میں کچھ کاغذی کارروائی ہونے کے بعد کانسٹیبل وہاں سے چلا گیا۔

تیمور کو قیدیوں کا لباس دیا۔ اس کا قیدی نمبر 400 تھا۔ جیلر اسے اس کے سیل میں لے گیا۔ اس کے سیل کو باہر سے تالا لگایا۔

''کس جرم میں آیا ہے۔''

''باپ کو قتل کیا ہے۔ سیدھا سینے پر گولی ماری۔''

''باپ رے۔ باپ کو ہی اڑا دیا۔''

دو پولیس والے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اسے وہاں بند کر کے چلے گئے۔ تیمور زمین پر بیٹھ گیا۔ دیواروں پر نظر ڈالی۔ کالی سیاہ دیواروں کو دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ پاس کوئی چادر لے

کر سو رہا تھا۔ آج کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوما۔ وہ غصے والا تھا بدتمیز تھا۔ پر سب نے کیسے مان لیا کہ تیمور رضا اپنے باپ کو قتل کر سکتا ہے۔ ڈی ایس پی آفتاب اور ثاقب بیگ دوست ہیں۔ وسیم اور لیلیٰ نے میرے خلاف گواہی دی۔ سب ملے ہوئے ہیں۔ اسکی سمجھ میں سب آنے لگا۔ مجھے پھنسایا گیا ہے۔ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔ پر پاپا کو کس نے مارا؟

وہ پھوٹ کر رو پڑا۔

''رو لو جتنا رونا ہے۔ پہلی بار ہر کوئی روتا ہے۔ بلکہ دل کھول کر رو لو۔ کوئی منع نہیں کرے گا۔'' چادر ہٹا کر وہ لڑکا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر سولہ سال ہو گی۔ دیکھنے میں زیادہ عمر کا لگتا تھا۔

''میرا نام عزیز ہے۔ اور تمہارا؟''

''تیمور۔ پر میں نے اپنے باپ کا قتل نہیں کیا۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''اچھا۔ چلو قید مبارک ہو۔ آج پہلا دن ہے آرام کر لو۔'' دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔

''تم کس جرم میں آئے ہو؟''

''چوری۔۔۔ چوری۔''

''تم نے کیا چرایا تھا؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''بائیک کا سائیلنسر۔'' اس نے بھونیں اچکائیں۔

تیمور نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ وہ روتا رہا۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ پھر بھی وہ روتا رہا۔ نیند واقعی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ وہ ادھر ہی سو گیا۔ ابھی ادھر لمبا عرصہ کاٹنا تھا۔

وہ سارا دن خاموش رہتا۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتا۔ ایک دن جیلر نے اسے بتایا تم سے

کوئی ملنے آیا ہے۔ تیمور بہت حیران ہوا۔اسے لگا شاید رحمت خان آئے ہوں۔ جیلر اسے اپنے ساتھ ملاقاتی روم میں لایا۔

''کیسے ہو تیمور رضا۔'' ثاقب بیگ تھری پیس سوٹ میں کھڑا تھا۔

''وہ گن تم نے مجھے دی تھی ناں۔'' اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''میں نے تم کو گن دی تھی۔ بالکل دی تھی پر چلانے کو نہیں دی تھی۔ خیر غصے میں ہو جاتا ہے۔'' وہ کرسی پر شان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ ''یہ کچھ پیپرز ہیں ان پر سائن کر دو۔ میں کوشش کروں گا تمہاری سزا کم ہو جائے۔'' پیپرز اور پین تیمور کے آگے رکھے۔

''میں ہرگز سائن نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں پاپا نے ایسے ڈاکومنٹس تیار کروائے تھے۔ جب تک تیمور رضا سائن نہیں کرے گا۔ یہ پراپرٹی کوئی نہیں بیچ سکتا۔ میں تیمور رضا ان پر کبھی دستخط نہیں کروں گا۔''

''رسی جل گئی بل نہ گیا۔''

''تم میرے پاپا کے نوکر تھے۔ کئی بار ہیرا پھیری کرتے ہوئے پاپا نے تمہیں پکڑا تھا۔ تم اب بھی باز نہیں آئے۔ اپنی وہ بے عزتی یاد ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔''

''اپنی بکواس بند کرو۔'' وہ چیخا۔

وہ پر اعتماد تھا۔ ''تمہیں کیا لگا میں تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گا۔ تمہارے پیر پکڑوں گا۔ میں تیمور رضا ہوں۔''

''دیکھتے ہیں کب تک یہ اکڑ قائم رہتی ہے۔'' وہ اپنے کاغذات لے کر وہاں سے چلا گیا۔ ثاقب بیگ کو واقعی اس جواب کی امید نہیں تھی۔

تیمور واپس اپنے سیل میں آ گیا۔جیل کی ہوا نے اسے بدل دیا تھا۔وہ کافی بیمار بھی ہو گیا تھا۔ بس اس یقین پر سب برداشت کر رہا تھا۔اسے ایک دن اپنے پاپا کے قاتلوں کو ضرور پکڑنا ہے۔

☆......☆......☆

ستارہ کی عدت ختم ہو چکی تھی۔اس نے اپنی عدت آنٹی کے گھر ہی گزری تھی۔اپنے گھر ایک بار بھی نہیں گئی تھی۔آنٹی ہاجرہ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھیں۔عینی کی وجہ سے وہ بہت بیمار پڑ گئی تھیں۔اس بیماری کی وجہ سے انہیں کینسر ہو گیا تھا۔

ستارہ شام کو محلے کے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیتی۔رات کو پڑھنے بیٹھ جاتی۔اس بار اس کی تیاری پہلے سے بہت اچھی تھی۔

''آنٹی! آج میں نے پہلی بار پکوڑے بنائے ہیں۔کھا کر بتائیں کیسے ہیں۔'' ستارہ نے گرما گرم پکوڑے آنٹی کے آگے رکھے۔وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر زینی کے ہونے والے بچے کے لیے سویٹر بن رہی تھیں۔

''مزے کے ہیں۔بس دوبارہ نہ بنانا۔اتنی مرچیں۔'' انہوں نے ایک پکوڑا کھایا۔

''اچھا۔ہاہاہا۔بابا بھی ایسے کہتے تھے۔جب میں کوئی نئی چیز پکاتی تھی۔'' وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''تم اپنی امی سے کب ملو گی۔وہ تمہارے لیے بہت فکر مند ہیں۔والدین کو ایسے تکلیف نہیں دیتے۔''

''انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔اگر وہ چاہتیں تو میرے لیے لڑتیں۔آپ ہر بار یہی باتیں کیوں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔'' وہ خفا ہوئی۔

''انہیں تمہاری فکر ہے۔اب میری زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔تم ان سے صلح کر

لو۔" انہوں نے اس کے سر پر پیار کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں چائے بنا کر آتی ہوں۔" وہ اندر چلی گئی۔

"یہ بھی عینی کی طرح بات کو ٹال دیتی ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔" اسے دعائیں دینے لگیں۔

اس رات ستارہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی۔ آنٹی اپنے کمرے میں تھیں۔ گلاس گرنے کی آواز آئی۔ ستارہ فوراً کمرے سے باہر آئی۔ اسے لگا شاید بلی ہے۔ پر آواز آنٹی کے کمرے سے آئی تھی۔ اس طرف بھاگی، کمرے کی لائٹ آن کی۔ آنٹی فرش پر گر گئی تھیں۔ ان کی حالت کافی خراب تھی۔ وہ بے ہوش تھیں۔

ستارہ ان کی ہتھیلیاں اور پاؤں رگڑنے لگی۔ زینی آپی کو کال کی۔ وہ تھوڑی دیر میں دانش کے ساتھ پہنچیں۔ وہ ان کو لے کر ہسپتال چلے گئے۔ ان کو ایمرجنسی میں شفٹ کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ایمرجنسی سے باہر آیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟" دانش نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"سچ بولوں ان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ شاید ایک ہفتے کی مہمان ہوں آپ اللہ سے دعا کریں۔ وہ زندگی دینے والا ہے۔"

مولوی صاحب کی ڈاکٹر سے کافی دوستی تھی۔ جس کی بناء پر آنٹی کو علیحدہ روم میں رکھا گیا۔ ستارہ اور زینی دونوں بہت پریشان تھیں۔ وہ ساری رات ہسپتال میں رہے۔ زینی کو زبردستی گھر بھیج دیا۔ وہ ماں جو بننے والی تھی۔ ستارہ ساری رات ان کے پاس بیٹھی رہی۔

صبح آنٹی خدیجہ بھی حسن کے ساتھ ہسپتال پہنچ گئیں۔ آج کئی مہینوں بعد انہوں نے ستارہ کی شکل دیکھی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" آنٹی خدیجہ نے پوچھا۔

"مجھے ستارہ سے بات کرنی ہے۔" وہ اب بھی غنودگی میں تھیں۔ روم میں ستارہ اور آنٹی خدیجہ تھے۔ حسن باہر رکا تھا۔ دانش زینی کو لینے گھر پر گئے تھے۔

"جی بولیں میں سن رہی ہوں۔" ستارہ نے ان کا ہاتھ پکڑا۔

"اگر مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔ تم اپنی امی کے گھر چلی جانا۔ میری بات مانو گی ناں۔"

"آپ ٹھیک ہو جائیں۔" اس کے لگا تار آنسو بہہ رہے تھے۔

"مجھ سے وعدہ کرو۔" ان کی حالت کافی خراب تھی۔

"وعدہ کرتی ہوں۔ جو بولیں گی میں کروں گی۔" ستارہ نے حسن کو کہہ کر ڈاکٹر کو بلوانے کو کہا۔ آنٹی خدیجہ پاس موجود تھیں۔ وہ درود شریف پڑھ رہی تھیں۔

"ایک اور وعدہ کرو۔ تم پھر سے شادی کرو گی۔ جو بھی رشتہ آئے وہاں فوراً ہاں کہہ دو گی۔ اپنی امی کو پریشان نہیں کرو گی۔" ان کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

"میں وعدہ۔ کرتی۔ ہوں۔ آپ کی ہر۔ بات۔۔ مانوں۔ گی۔"

ڈاکٹر انہیں چیک کرنے آیا۔ ستارہ اور آنٹی خدیجہ روم سے باہر آ گئے۔ زینی آپی بھی اپنے شوہر کے ساتھ پہنچ گئیں۔ تقریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر باہر آیا۔

"آپ ان کی بیٹی ہیں۔ آپ ان سے مل لیں۔ وہ آپ کو بلا رہی ہیں۔" ڈاکٹر نے زینی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اندر چلی گئی۔

"آپ سب بس اللہ سے دعا کریں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی موت کا بہت صدمہ لیا ہے۔ اللہ ان کی آخرت آسان کرے۔"

اس شام کو ان کا جنازہ تھا۔ ان کی کنڈیشن کافی خراب تھی۔ اس لیے انہیں فوراً دفنا دیا۔

زینی کو اس کے سسرال والے گھر لے گئے۔اس حالت میں اس کا اپنے میکے رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ستارہ اس رات اپنی امی اور حسن کے ساتھ اس ہی گھر میں رکی۔وہ کرایہ کا گھر تھا۔اسے خالی کرنا تھا۔جو چھوٹا موٹا سامان تھا۔وہ ادھر ہی چھوڑ دیا۔باقی سامان زینی آپی اپنے ساتھ لے گئی۔

جام کی ڈلیوری کا سارا سامان ستارہ اگلے دن ہی اپنے گھر لے آئی۔اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خالی کر دیا گیا۔

ستارہ اپنے گھر میں سارا دن اپنے کمرے میں گزارتی۔آنٹی خدیجہ بھی کھانا پکانے کے بعد سارا وقت اپنے کمرے میں رہتیں۔اسد بھائی ان کو اپنے پاس امریکہ بلا رہے تھے۔چند ماہ کے اندر انہوں نے امریکہ چلے جانا تھا۔گھر کے ماحول کی وجہ سے ان کی صحت بھی کافی خراب ہو رہی تھی۔

سندس سے اس کا کبھی کبھی آمنا سامنا ہوتا۔وہ ہر بار ستارہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔جب موقع ملتا وہ طعنے مارنے سے باز نہ آتی۔ستارہ نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔اگر وہ کچھ بھی آگے سے کہتی تو اسے لڑنے کا موقع مل جاتا۔

حسن کا نام کرکٹ ٹیم میں سلیکٹ ہو گیا۔وہ اپنی پریکٹس کے لیے دوسرے ملک چلا گیا۔
ستارہ کے بورڈ کے پیپرز پھر سے شروع ہو گئے۔اس بار ستارہ نے تیاری بہت اچھی کی۔نویں اور دسویں کے بورڈ کے پیپرز اکٹھے دیے۔وہ کالج جانے کی تیاری میں تھی۔قسمت نے ایک بار پھر اس کے ساتھ کھیل کھیلا۔

اس کے لیے ایک رشتہ آیا۔وہ لوگ کافی امیر تھے اور لڑکے کی عمر ذرا بڑی تھی۔اس کا اپنا پراپرٹی کا بزنس تھا۔ستارہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے کو ہاں کہنا پڑا۔اس نے اپنا وعدہ جو

پورا کرنا تھا۔

''آپ اس رشتے کے لیے ہاں کہہ دیں۔ جب میں تکلیف میں تھی تو اس وقت صرف آنٹی نے میرا ساتھ دیا تھا۔'' ستارہ اپنے ماں کے کمرے میں کھڑی تھی۔ ''مجھے صرف اپنی پڑھائی کی فکر ہے۔''

''ویسے وہ کہہ رہے تھے لڑکی آگے پڑھ سکتی ہے۔''

''پہلے سب ایسے ہی کہتے ہیں۔ بعد میں اصلیت سامنے آتی ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''میں ایک بار غلطی کر چکی ہوں دوبارہ نہیں کرنا چاہتی۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ مانتی ہوں تم نے وعدہ کیا تھا۔ پر کم از کم گریجویشن تو کر لو۔''

''آپ ان کو ہاں کہہ دیں۔ آپ نے امریکہ چلے جانا ہے۔ میں سلیم بھائی کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی۔ میری قسمت خراب ہے۔ جو تکلیفیں لکھی ہیں وہ کاٹنی ہیں۔''

''ایسے نہ کہا کرو۔''

''آپ ابھی انہیں فون کر کے ہاں کہہ دیں۔ اور ان کو سچ بتانا مجھے پہلے طلاق ہو چکی ہے۔''

☆......☆......☆

ستارہ ایک بار پھر سے دلہن بنی۔ لڑکے والوں کا بڑی شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ پر شادی سے ایک ہفتہ پہلے لڑکے (رفیق) کی دادی کو فالج ہو گیا۔ جس کی وجہ سے شادی بالکل سادگی سے کی گئی۔

سلیم اس شادی سے ذرا خوش نہیں تھا۔ اس نے غیروں کی طرف شادی اٹینڈ کی۔ سندس اپنے میکے چلی گئی۔ یہی سب کے لیے بہتر تھا۔ ورنہ وہ آگ لگانے سے باز نہ آتی۔

شادی کے دس دن بعد آنٹی خدیجہ امریکہ چلی گئیں۔ نئے گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔

رفیق کے تین چاچو اور خود رفیق کے خود کے پانچ بھائی اپنی فیملیز کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے۔یہ آٹھ گھر اکٹھے بنے ہوئے تھے۔پورے محلے میں ان ہی کے گھر تھے۔ان گھروں کی چاردیواری ایک تھی۔باہر سے دیکھو تو بڑی حویلی لگتی تھی۔

رفیق اپنی دادی اور بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔دادی اور رفیق کا کمرہ ساتھ تھا۔وہ دادی کا لاڈلا تھا۔

”تو تم نے یونیورسٹی کا ڈین بننا ہے۔ٹیچر کیوں نہیں یا کوئی پروفیسر۔“

”بس میرا بچپن سے شوق ہے۔میں کسی بڑی یونیورسٹی کی ڈین بنوں۔“ ہینگر سے کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا۔”آپ نے بتایا نہیں آپ کتنا پڑھے ہیں۔“

”آٹھ جماعتیں پاس ہوں۔“صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے پہنے۔

”تو کیا میں آگے پڑھ سکتی ہوں؟ میرا رزلٹ آنے والا ہے۔کیا کالج میں ایڈمیشن لے لوں؟“

رفیق سفید رنگ کی کلف والی شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔پیروں میں پشاوری چپل تھی۔اس کا قد درمیانہ تھا۔وہ کئی سالوں سے پراپرٹی کا کام کر رہا تھا۔اس بزنس نے اس کے لہجے کو بہت سخت بنا دیا تھا۔

”پہلے گھر پر رہ کر گھر کے کچھ کام سیکھ لو۔یہ پڑھائی بعد میں بھی ہوتی رہے گی۔“

اس نے انکار کر دیا۔کرسی کی پشت سے اپنا کوٹ اٹھایا۔میز سے اپنا فائلوں والا بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گیا۔ستارہ کی آنکھیں نم پڑ گئیں۔اس کا خواب پھر ٹوٹ گیا۔اس کے پورے خاندان میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔اپنا ٹوٹا دل لے کر کمرے کی صفائی کی۔دادی سے بھی پڑھنے کی اجازت مانگی پر انہوں نے بھی انکار کر دیا۔

اپنی بدقسمتی سمجھ کر چپ ہوگئی۔ پہلے ہی اس کی پہلی طلاق کو لے کر اس کے سسرال والے کوئی نہ کوئی بات کر دیتے تھے۔ ایک ذرا سی بات ہوتی پورے خاندان میں پھیل جاتی۔ اتنی سمجھ تو تھی کہ اپنا گھر خراب نہیں کرنا۔ اپنے شوہر کی بات مان لی۔

گرمیوں کو موسم تھا۔ پچھلے ایک ماہ سے سورج خوب آگ برسا رہا تھا۔ آج دوپہر سے ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ سورج غائب ہوا تو موسم خوشگوار ہوگیا۔

اس شام وہ کچن کا کام کر کے واپس اپنے کمرے میں آئی۔ چوڑی دار پاجامہ کے اوپر جالی کی جامن رنگ کی شرٹ زیب تن تھی۔ بالوں کی بیک کومبنگ بنائی تھی۔ دادی اماں کی نرس سے اس کی دوستی تھی۔ وہ دونوں فارغ وقت ایک ساتھ گزارتیں۔ آج اس نے ہی ستارہ کا ہیئر سٹائل بنایا تھا۔ اس کی ابھی تک باقی گھر والوں سے زیادہ دوستی نہیں ہوئی تھی۔ رفیق نے چند سالوں میں پراپرٹی کے کام میں اپنی محنت سے بہت ترقی کی تھی۔ اس کے کچھ کزن اس سے جیلس بہت تھے۔ وہ بس اپنے کام سے تعلق رکھتی۔ اپنے کمرے میں آ کر بالکوانی میں بیٹھ گئی۔

ڈوبتا سورج آج کچھ الگ دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان پر اڑتے پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ چند ہفتوں تک سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔ موسم میں اداسی تھی۔

”تم تیار رہنا آج شام کو ایک دعوت ہے۔ ایک بہت بڑی پراپرٹی کا کنٹریکٹ ملا ہے۔ اگر یہ ڈیل فائنل ہوگئی تو سمجھ جاؤ ہماری کروڑوں کی لاٹری لگ گئی ہے۔“

شادی کے سات ماہ اس نے پہلی بار رفیق کو اتنا خوش دیکھا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے کام میں مصروف رہتا۔ اکثر ہفتوں تک گھر سے باہر رہتا۔ جب گھر پر بھی ہوتا تو اپنی فائلوں میں گھسا رہتا۔ ایک خوش خبری ستارہ کے پاس بھی تھی۔ اس کا رزلٹ کب کا آ چکا تھا اور وہ بہت اچھے

نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔اسے کئی بار بتانا چاہتی تھی پر خاموش ہوگئی۔

”کب تک نکلنا ہے؟“اپنے شوہر سے بیگ لے کر میز پر رکھا۔

”ابھی نکلنا ہے۔میں کپڑے بدل لوں۔“

”آپ مجھے فون پر بتادیتے میں تیار رہتی۔میں دادی اماں کو کھانا دے آؤں۔“

”کپڑے بدل کر جاؤ۔اکثر وہ لمبی باتیں شروع کردیتی ہیں۔میں بھی کپڑے بدل کر ان کے پاس آتا ہوں۔کافی دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“وہ اپنی کسی فائل میں لگ گیا۔

وہ ہمیشہ ایسا کرتا عین موقع پر بتاتا کہ کہیں جانا ہے۔ستارہ کو صرف کپڑے بدلنے تھے۔ پنک کلر کی میکسی کے نیچے چنٹوں والا پاجامہ پہنا۔زیادہ ٹائم نہیں تھا اس لیے ہلکا سا میک اپ کیا۔رفیق ٹائم کا پابند انسان تھا۔وہ اس کا موڈ آف نہیں کرنا چاہتی تھی۔کمرے سے نکلنے سے پہلے رفیق پر نظر پڑی۔وہ اپنی فائل پر جھکا ہوا تھا۔تمام سرکاری کاغذوں کا ایک ایک لفظ کا جائزہ لیتا تھا۔

وہ تیار ہوکر دادی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ان کی حالت پہلے سے بہتر تھی۔روزانہ ڈاکٹر آکر انہیں چیک کرتا۔ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس بھی رکھی تھی۔ان کا سارا خرچہ رفیق اٹھاتا تھا۔دادی اماں کو کھانا دینے کے بعد وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

کافی دیر گزر گئی رفیق نہیں آیا۔کمرے میں لگی گھڑی پر نظر پڑی۔

”دادی!میں جا کر خود دیکھتی ہوں۔انہوں نے آپ سے ملنا تھا۔ابھی تک فائل میں کھوئے ہوں گے۔“

”جا،اس سے کہہ،میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔اور میرے پوتے سے لڑنا ناں۔وہ بہت تھکا ہوا ہے۔“دادی وہیل چیئر پر تھیں۔

''جی نہیں لڑتی آپ کے لاڈلے پوتے سے۔'' وہ اس سے کافی مانوس ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر جانے لگی دادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سن خوشخبری کب سنائے گی؟'' ماتھے پر تیوری پڑی۔

اچانک پوچھے جانے والے اس سوال پر ستارہ بوکھلا گئی۔ پاس بیٹھی نرس بھی ہنس پڑی۔ وہ ستارہ کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ وہ بھی شادی شدہ تھی۔ اس کے چھوٹے بچے تھے۔ ستارہ ان کے لیے اکثر کوئی گفٹ بھیجتی رہتی۔

''کیوں میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔'' وہ خفا ہوئیں۔

''آپ کے لاڈلے پوتے بہت مصروف ہیں اور۔۔۔''

''اچھا اسے ادھر بلا اس کے ابھی کان کھینچتی ہوں۔''

ستارہ شرماتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ راہداری سے گزر کے اپنے کمرے میں پہنچی۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ آرام سے زینے چڑھتی اوپر منزل تک پہنچی۔

گولی چلنے کی آواز سے اس کے رنگ اڑ گئے۔ آواز شاید چھت سے آئی تھی۔ وہ اوپر کو بھاگی۔ جب چھت پر پہنچی اس کے پیر ادھر جم گئے۔ رفیق کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کی چیخ کی آواز پورے گھر میں سنائی دی۔ چند پل تھے پورا گھر اکٹھا ہوگیا۔ وہ تو ادھر بیہوش ہوگئی۔ رفیق کو فوراً ہسپتال لے گئے۔ اس کی حالت کافی نازک تھی۔

رات کا پورا خاندان ہسپتال میں تھا۔ رفیق آئی سی یو میں تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کر دی تھی۔ ستارہ گھر پر دادی کے پاس تھی۔ رفیق کی سب سے چھوٹی چاچی نے ستارہ پر الزام لگا دیا۔ پولیس اس سے سوال کرنے لگی۔

”جب آپ چھت پر پہنچی تو آپ نے کیا دیکھا تھا۔“

ستارہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔وہ دادی اماں کے پاس فرش پر بیٹھی تھی۔ رفیق کی دادی اللہ سے رفیق کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

ہسپتال سے خبر آئی رفیق اس دنیا میں نہیں رہا۔سارے گھر والے گھر پہنچ گئے۔چاچی نے فوراً ستارہ کے کپڑے بدلوائے۔اس کا میک اپ صاف کردیا۔

رفیق کی لاش کو لے کر گھر پہنچے۔پورا گھر سوگوار تھا۔کسی کو یقین نہیں آرہا تھا۔ہر کوئی اپنے غم میں ڈوبا تھا۔چاچی نے اس وقت سب کو اکسایا۔یہی اپنے شوہر کی قاتل ہے۔اس کے شوہر کی لاش گھر پر پڑی تھی۔پولیس ستارہ کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔

وہ اس اندھیرے کمرے میں بند تھی۔دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔سانس خشک ہوگئی۔رفیق۔

بلب کی روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔انسپکٹر کامران اس لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ واپس آئے۔

”جا اپنے گھر واپس۔تیرے شوہر کا قاتل پکڑا گیا ہے۔“انسپکٹر کامران اپنی بھاری آواز میں بولے۔

لیڈی کانسٹیبل نے چاچی کو اب تھانے میں بند کیا۔ستارہ پہلے ہی صدمے میں ڈوبی تھی۔

”اس ہی چاچی کے بیٹے نے رفیق کو قتل کیا ہے۔اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے الزام تم پر لگا دیا۔گن ان ہی کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔بیٹا تو بھاگ گیا ہے پر جلد ہی اسے پکڑ لیں گے۔“لیڈی کانسٹیبل نے ستارہ کو جانے کا اشارہ کیا۔

ستارہ لڑکھڑاتی ہوئی تھانے سے باہر آئی۔نرس اور رفیق کا بھائی گاڑی میں اسے لینے

آئے تھے۔اس سے معافی مانگی۔ایسی حالت میں کسی کو کیا یاد رہتا ہے۔

وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ستارہ کی زندگی ایک بار پھر اجڑ گئی۔اس کی قسمت نے پھر اسے دھوکہ دیا۔وہ خودکشی کرنا چاہتی تھی۔عینی کی ماں کی حالت اس نے اپنے آنکھوں سے دیکھی تھی۔

اس بار عدت اپنے سسرال میں گزاری۔رفیق کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں تھے۔وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔رفیق کے جانے کے بعد اس کے سسرال والے نہیں چاہتے تھے۔اس جائیداد میں سے کچھ اسے بھی ملے۔اس لیے عدت ختم ہوتے ہی اسے واپس اس گھر میں آنا پڑا۔دادی اماں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر پائیں۔ستارہ ابھی ینگ تھی۔اور نہ ہی اس کے بچے تھے۔اس لیے ان کو بھی یہی ٹھیک لگا کہ ستارہ اپنے میکے واپس چلی جائے۔

اس بار آنٹی خدیجہ بھی اس کے پاس نہیں تھیں۔وہ پاکستان نہ آسکیں۔ان کے گھٹنوں کا آپریشن ہوا تھا۔حسن بھی اپنی دنیا میں مصروف تھا۔سندس نے اس بار اپنا سچا رنگ دکھایا۔جو پہلے نہ کرسکی تھی اس بار کر دکھایا۔

☆......☆......☆

قید کا ایک دن بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔وقت کے ساتھ ساتھ ایک پل بھی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔پاکستان کی جیلوں کا حال سن کر شاید شیطان بھی اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔جو لوگ جانور پالتے ہیں جیسے مرغیاں، بکریاں ان کی بھی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ان کو وقت پر خوراک دینا، تازہ آب و ہوا میں رکھنا، موسم کے مطابق ان کا خیال رکھنا۔ان کی نہ صرف ضرورتوں کا بلکہ صحت کا بھی خیال کرتے ہیں۔اس کے برعکس جیلوں میں قیدیوں کی زندگی بہت ناقص ہے۔

تیمور نے پہلی رات علیحدہ سیل میں کاٹی۔ اگلے دن جیل سپرنٹنڈنٹ نے اسے دوسرے قیدی بچوں کے ساتھ شفٹ کر دیا۔ تیمور رضا نے کسی فلم میں ایسی زندگی نہیں دیکھی تھی۔ جواب وہ گزارنے والا تھا۔

یہاں بڑے ہالز تھے جن میں بے شمار بچے تھے۔ سب کی عمریں اٹھارہ سال سے کم تھیں۔ سب گھریلو شلوار قمیض میں اور بہت کمزور تھے۔ کچھ زمین پر لیٹے سو رہے تھے۔ ان کے جسم پر چوٹوں کے نشانات واضح تھے۔ صاف لگ رہا تھا انہیں مار پڑی ہے۔ کچھ آپس میں باتوں میں مصروف تھے۔

''جا ادھر جا کر پڑ جا۔ اور تیری کوئی شکایت آئی تو یاد رکھنا۔'' جیل سپرنٹنڈنٹ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

تیمور بھاری قدموں اور پھٹی آنکھوں سے ایک کونے میں اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے ہال کے کچھ بچے اسے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہال کے اندر ہی واش روم بنے تھے۔ جن سے بہت سخت بدبو آ رہی تھی۔ وہاں سیوریج کا نظام انتہائی ناقص تھا۔

''کس جرم میں آئے ہو؟'' خاکی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ایک بچے نے سوال کیا۔

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے سارے بچے ایک ہال میں ہونے کی وجہ سے یہاں سخت گرمی تھی۔ وہ تو فل ایئر کنڈیشنر میں رہنے کا عادی تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے لگژری روم میں قدم بھی نہیں رکھتا تھا۔

وہ کئی گھنٹوں تک ایسا ہی بیٹھا رہا۔ دوپہر کو کھانے کے وقت ابلے چاولوں کے ساتھ پانی والی دال تھی۔ سب قیدی بچے اپنی پلیٹ اٹھا کر کھانا لینے چلے گئے۔

''تم نے کھانا نہیں کھانا۔ بعد میں نہیں ملے گا۔'' وہی بچہ اسے کہہ کر چلا گیا۔

واش روم سے اٹھنے والی بدبو اور گرمی سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔اب جو انسان برانڈڈ چیزیں استعمال کرتا ہو، شہزادوں جیسی زندگی جی رہا ہو۔اس ماحول میں اس کی کیا حالت ہوگی۔

''چل اٹھ کر ہمارے برتن دھو۔'' تین چار لڑکے اس کے سر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ان کی عمریں بھی زیادہ تھیں۔

تیمور بدستور خاموش بیٹھا رہا۔ان میں سے ایک لڑکے نے تیمور کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔

''سنائی نہیں دیتا۔بہرے ہو۔'' اسے پکڑ کر جھنجھوڑا۔اس چودہ سالہ لڑکے نے اس لڑکے کو زور سے دھکا دے دیا۔وہ لڑکا ادھر ہی زمین پر گر گیا۔

جب اس کے ساتھیوں نے دیکھا انہوں نے تیمور پر حملہ کر دیا۔وہ ادھر ہی زمین پر گر گیا۔باقی سب بچے تماشا دیکھنے لگے۔اس کے چیخنے کی آواز سن کر جیل وارڈن گالیاں بکتا ہوا آیا۔

''کیا تماشہ لگا رکھا ہے؟'' وہ آتے ہی جیل کی سلاخوں پر ڈانڈا برسانے لگا۔وہ لڑکے پیچھے ہٹ گئے۔وہ ادھر ہی لیٹا چیختا چلاتا رہا۔سب نے ایسا ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔یہ یہاں روز کا معمول تھا۔جیل وارڈن دو چار مزید گالیاں نکال کر چلتا بنا۔☆

''یہاں رہنا ہے تو یہ سب کرنا ہوگا۔'' خاکی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس بچہ دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔''تم ابھی ادھر نئے ہو دھیرے دھیرے یہاں کے عادی ہو جاؤ گے۔ یہاں کوئی چپ نہیں کرواتا۔کوئی ملنے بھی نہیں آتا۔''

شام تک وہ ادھر بے سدھ پڑا رہا۔اس لڑکے نے اسے پانی لا کر دیا۔تیمور نے ہمت کر کے دو گھونٹ پانی پیا۔

''مجھے واش روم جانا ہے۔''

”وہ سامنے ہیں پانی دھیان سے استعمال کرنا۔ پانی بہت کم آتا ہے۔ جو بھی ہے سب وہی استعمال کرتے ہیں۔“

تیمور اٹھ کر واش روم گیا۔ وہاں کی حالت دیکھ کر اس کی قے نکل آئی۔ جیسے تیسے کر کے واپس آیا۔ وہی لڑکے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

”ان سے بچ کر رہنا۔“ اس خاکی بچے نے اپنی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ ”رات کو کھانا ملے تو کھا لینا۔ کب تک بھوکے رہو گے۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ تیمور نے پہلی بار اس سے سوال کیا۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

”اکبر۔“ فوراً بولا۔ ”اور تمہارا؟“

”تیمور۔“

رات کا کھانا دونوں نے ساتھ میں کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد لائٹس آف کر دیں۔ اس ہال میں رات کو دوسرے ہال سے بھی قیدی بچے آ کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ عالم یہ تھا جو جس طرح لیٹا ہے۔ اس حالت میں لیٹا رہا۔ ہلنے تک کی جگہ نہ تھی۔

تیمور کو ان سب کی کہاں عادت تھی۔ وہ ادھر ہی چلانے لگا۔ اکبر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے وہ اسے سمجھتا۔ جیل وارڈن واپس آیا۔

”کس کمینے کو آج تکلیف ہو رہی ہے۔“ ڈانڈا اس نے بغل میں دبایا ہوا تھا۔

”میں یہاں نہیں سو سکتا۔ اتنی بدبو آ رہی ہے۔“

”ادھر آ میں تجھے وی آئی پی جگہ پر سلاتا ہوں۔“

وہ اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا ساتھ لے گیا۔ تیمور کی چیخوں کی آواز پورے جیل میں گونجی۔ یہ مار تھانے والی مار کے سامنے کچھ نہ تھی۔ اسے سزا کے طور پر مرغا بنا کر رکھا۔

''آئندہ اگر اپنی زبان چلائی تو یاد رکھنا۔ تیرا وہ حشر کروں گا تیری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔'' اس کا کان زور سے مروڑا۔

تیمور کو واپس اس کی جگہ پر پھینک کر وہ وارڈن چلا گیا۔ وہ تو بس جیسے سانس لے رہا ہو۔ پورا جسم بے سدھ تھا۔ تیمور کی پہلی رات جیل میں ایسی ہی گزری۔ اس ہی رات اس کی عقل ٹھکانے آ گئی۔

تیمور کو جیل میں اب ایک ماہ ہو چکا تھا۔ وہ اب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چیختا۔ گرمی سے اس کا برا حال ہو جاتا۔ جیسے کبھی پسینے کی ایک بوند نہ آئی ہو۔ آج اس پر ترس کھانا جائز تھا۔ صرف اکبر سے ہی اس کی کچھ سلام دعا ہوئی تھی۔

''تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ کس جرم میں آئے ہو۔''

''تیرہ سال کا ہوں۔ چوری کے جرم میں آیا ہوں۔'' اکبر ظہر کی نماز پڑھ کر آیا تھا۔

''تمہارے گھر والے، وہ کہاں ہیں؟''

''گاؤں میں۔ میں شہر میں کام کے لیے آیا تھا۔ ایک جگہ چوری ہوئی پولیس مجھے پکڑ کر لے آئی۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''تو تم نے چوری نہیں کی۔'' اسے حیرت ہوئی۔

''نہیں میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ میرے گھر والوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کیس لڑ سکیں۔'' اس کی آنکھیں نم تھیں۔

تیمور نے پہلی بار اپنے سامنے بیٹھے اس بچے کو غور سے دیکھا۔ وہ تسبیح پڑھ رہا تھا۔ اس کے بال گولڈن، آنکھیں سبز اور گال لال تھے۔ وہ بڑا پیارا بچہ تھا۔

اس قید خانے میں تیمور کئی بار جیل وارڈن سے پٹ چکا تھا۔ وہ ہر وقت غصے میں رہتا۔ کئی

بار دوسرے بچوں سے بھی جھگڑ چکا تھا۔

"یہ کپڑے کہاں سے آئے ہیں۔ یہ تو کسی کے پہنے ہوئے ہیں؟" جیل سپرنٹنڈنٹ اس روز بچوں کو ان کے قد کے حساب سے کپڑے بانٹ رہا تھا۔ سب بچے قطار میں کھڑے تھے۔ وہ سب شلوار قمیض تھیں۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر تیمور نے ناک چڑھایا۔

"سب ادھر یہی کپڑے پہنتے ہیں۔ انسان کا بچہ بن اور آرام سے جو مل رہا ہے وہ لے لے۔ اگر اتنا نخرہ ہے تو کپڑے گھر سے منگوا لے۔ یہ سب کپڑے ڈونیشن کے ہیں۔"

ڈونیشن کا نام سن کر تیمور طنزیہ ہنسا۔ وہ جب سے ادھر آیا تھا۔ ٹراؤزر شرٹ میں تھا۔

"مجھے یہ کپڑے نہیں چاہئیں۔"

"جا، دفعہ ہو جا یہاں سے۔" سپرنٹنڈنٹ کو غصہ چڑھ گیا۔

"مجھے شیمپو اور اپنا الگ سے صابن چاہیے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے وارڈن کو آواز لگائی۔ اگر یہ ایک سیکنڈ بھی مجھے اور نظر آیا۔ تو میں نے تیرا سر پھاڑ دینا ہے۔" کرسی پر بیٹھا سپرنٹنڈنٹ کا پارہ چڑھ گیا۔ جیل وارڈن تیمور کو وہاں سے گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ اس کے ساتھ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس کے جسم پر کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ جہاں زخم کے نشانات نہ ہوں۔

جیل کی زندگی سے اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ پر اسے عمر قید کاٹنی تھی۔

دن گزرے، ہفتے گزرے اور مہینے۔ اسے اس جیل میں اب ایک سال ہونے کو تھا۔ وہ بھی اب عطیہ کی ہوئی شلوار قمیض پہننے لگا تھا۔ ہفتے میں ایک بار انہیں کھلے گراؤنڈ میں جانے کی اجازت تھی۔ اس نے ایک بات نوٹ کی۔ اب اکثر رات کو اکبر اس کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اس سے پوچھنے کی بھی کوشش کی پر وہ خاموش رہتا۔

"تم رات کو کہاں غائب ہوتے ہو۔"

"میں۔ میں۔ کہیں نہیں۔ تم ہمیشہ غصہ کرتے ہو، لڑتے ہو۔ کبھی نماز پڑھ لیا کرو۔ تسبیح پڑھ لیا کرو۔" اپنی تسبیح تیمور کی گود میں رکھ دی۔ تسبیح صندل کی لکڑی کی بنی تھی۔

اس رات اکبر کو بہت تیز بخار ہو گیا۔ تیمور کے شور ڈالنے پر جیل وارڈن اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ دو دن گزر گئے وہ واپس نہ آیا۔ اس نے وارڈن سے پوچھا پر وہ اسے ٹال دیتا۔

چار دن بعد اسے پتا چلا اکبر اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ تیمور کو یقین نہیں آیا۔ وہ سیدھا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ وہ مزے سے بیٹھا نان چنے کھا رہا تھا۔

"ارے بخار تیز ہو گیا تھا، مر گیا۔ اچھا نہیں ہال میں اب جگہ بڑھ جائے گی۔"

"بڑے بے حس ہو۔"

"ہاں ہوں چل دفعہ ہو جا یہاں سے۔" نان کا لقمہ لیا۔

تیمور واپس اس جگہ پر آ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جہاں وہ پہلی بار بیٹھا تھا۔ اکبر نے اسے پانی لا کر دیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اکبر وہ چھوٹا بچہ اب نہیں رہا۔ جن چار لڑکوں سے اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ آج اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

"تجھے پتا ہے اکبر کہاں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔" ان میں سے ایک لڑکا بولا۔

"اسے بخار تھا اور ٹائم پر میڈیکل نہ ملنے کی وجہ سے۔" آج وہ لڑنے اور بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔

"جھوٹ۔" وہ پھر بولا۔ تیمور نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ شکل سے مجرم لگتا تھا۔

"اسے انہوں نے مار دیا۔" اپنے آس پاس نظر دوڑائی اور آہستہ سے بولا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

"اس کا ریپ ہوا ہے۔ یہ جو وارڈن ہے اس ہی نے۔۔۔"

تیمور پر جیسے بم گرا ہو۔ پورے جسم پر آگ بھڑکی ہو۔ اس نے اس لڑکے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ ہال میں پھر شور پڑ گیا۔ اس کے دوستوں نے اسے چھڑوانے کی کوشش کی۔ تیمور اس کے اوپر لیٹا ہوا تھا۔

"قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اکبر کا ریپ ہوا تھا۔ مار دیا سالوں نے اسے۔" اس نے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔

اتنے میں وہی وارڈن ادھر پہنچا۔ ان دونوں کو علیحدہ کیا۔ اس سے پہلے وہ ڈانڈا چلاتا، تیمور اس لڑکے کو چھوڑ کر اس وارڈن پر چڑھ گیا۔ اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔

یہ اس کی ایک چال تھی۔ اسے بھی جیل میں رہتے ہوئے سال سے اوپر ہو گیا تھا۔ بہت کچھ وہ بھی سمجھ چکا تھا۔ وہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ وارڈن کچھ زیادہ ہی اکبر کے ساتھ مہربان ہو رہا تھا۔ وارڈن اس حملہ کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ ادھر ہی زمین پر گر گیا۔ اب تیمور اس کے اوپر تھا۔ اور وہ نیچے لیٹا اسے گالیاں اور دھمکیاں دینے لگا۔

سب بچے کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے لگے۔ وہ چاروں لڑکے بھی حیران رہ گئے تھے۔ شور کی آواز سن کر دوسرے پولیس والے وہاں پہنچے۔ انہوں نے تیمور کو ڈانڈے مار کر اس وارڈن سے دور کیا۔

اس وارڈن کی تیمور نے چند منٹوں میں بری حالت کر دی تھی۔ وہ بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ دو پولیس اہلکار تیمور کو جکڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اگر وہ اس کو نہ روکتے تو شاید وہ اس وارڈن کو جان سے مار دیتا۔

"تو دیکھ کیا حشر کرتا ہوں تیرا۔ اکبر سے بھی بری موت مرے گا۔" وہ زمین پر بیٹھا تیمور کو

گھور رہا تھا۔

اس کے ان لفاظ سے تیمور نے پھر اس پر جنگلی شیر کی طرح حملہ کر دیا۔ وارڈن پر زناٹے دار تھپڑوں کی بارش کر دی۔ اب وارڈن کی چیخنے کی آواز جیل میں گونجی۔ ان دونوں پولیس اہلکاروں نے بڑی مشکل سے تیمور کو اس سے الگ گیا۔

اسے کپڑوں سے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ علیحدہ سیل میں لے گئے۔ وارڈن نے اپنی ٹوپی اٹھائی، لڑکھڑاتا ہوا وہاں سے نکلتا بنا۔ سب بچے اب بھی سکتے کی حالت میں تھے۔

''اس نے اب تیمور کی کھال اتار دینی ہے۔''

''شاید وہ اب زندہ بچ کر واپس نہ آئے۔''

''ویسے اکبر کے ساتھ بہت برا ہوا۔ بیچارہ اس کی ہوس کا نشانہ بن گیا۔''

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا تیمور یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''

''آج رات کان بند کر کے سونا۔''

سارے بچے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تیمور کو سیل میں بند کیا۔ پہلے ان دونوں اہلکاروں نے اسے ڈنڈوں سے ایسے پیٹا جیسے وہ کوئی بے جان چیز ہو۔ اسے خوب پیٹا خوب مارا۔ اپنا غصہ نکال کر وہ اسے سیل میں بند کر کے چلے گئے۔

اتنی مار کھانے کے بعد اس نے اپنے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ آنکھیں بند کر کے مار کھاتا رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے اکبر کا چہرہ گھومتا رہا۔ جب اس نے پہلی بار اسے پانی لا کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ اس نے اپنی آدھی روٹی تیمور کو دے دی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ نماز پڑھنے کے لیے کہتا اور وہ ہر بار ٹال دیتا۔ ادھر لیٹے ہوئے اس کے شرمندگی سے آنسو نکل آئے۔ وہ کبھی اکبر کو یہ نہ بتا سکا۔ اسے نماز پڑھنی نہیں آتی۔

وہ رات تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ اپنے ماضی کو بھی یاد کرتا رہا۔ کب آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔ ٹک کر کے سیل کا دروازہ کھلا۔ وارڈن اندر داخل ہوا۔

''بڑی چربی چڑھی ہے نہ تجھ میں۔''

اس نے تیمور پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اسے تب تک مارتا رہا جب تک وہ خود تھک نہ گیا۔ وہ لڑکا اسے اور غصہ دلاتا رہا۔ آج جب اسے مار پڑ رہی تھی تو پہلی بار تیمور آگے سے ہنستا رہا۔

''جب تک تو اس جیل میں میرے ساتھ ہے۔ دیکھ تیرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔''

وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کا کھانا پینا بند کر دیا۔ پورا ہفتہ اسے خوب ٹارچر کیا۔ اس پر زندگی تنگ کر دی۔ پورے ایک ہفتے بعد وہی دو پولیس اہلکار اسے کندھوں سے لگائے واپس اس جیل میں لا کر پھینک گئے۔

ان دونوں کے جاتے ہی چار لڑکے تیمور کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ واپس زندہ آ گیا ہے۔

''ہمیں لگا تم اب واپس نہیں آؤ گے۔ تم ٹھیک تو ہو۔''

تیمور نے اپنی آنکھوں سے اشارہ کیا اور اپنی آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اس کا سارا جسم نیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہی بچے اسے کھانا لا دیتے، اسے پانی لا دیتے۔ دس دن بعد اس کی حالت میں کچھ سدھار آیا۔

آج پورے جیل کی صفائی کی جا رہی تھی۔ کچھ بڑے آفیسرز چیکنگ کے لیے آ رہے تھے۔ وہ ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ، وہی وارڈن ان کے ساتھ ساتھ پھر رہے تھے۔ وہ کچھ قیدی بچوں سے بھی سوال جواب کر رہے تھے۔ جب تیمور کے پاس پہنچے

ان کے بات کرنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''اس وارڈن نے اکبر جو چھوٹا بچہ تھا، اس کا ریپ کیا تھا۔ اسے جان سے مار دیا ہے۔ دیکھیں اب بھی مجھے گھور رہا ہے۔''

''یہ۔ یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ بول رہا ہے۔'' اس وارڈن کو تیمور سے یہ امید بالکل نہیں تھی۔ اتنی مار کھانے کے بعد بھی۔

ان پولیس آفیسر نے وارڈن اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو اپنے آفس میں بلایا۔ اندر کیا ہوا اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ بس ہفتے بعد یہ بات پوری جیل میں پھیل گئی۔ اس وارڈن کو معطل کر دیا ہے۔ اس وارڈن کو سزا تو نہیں ملی پر تیمور کو اس بات سے کچھ راحت تھی۔ اس نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے کچھ کیا تھا۔

جیل میں اب وہ اپنے برتن دھونے کے ساتھ اپنی باری پر جیل کی صفائی بھی کرتا۔ سارا دن خاموش رہتا۔ اس دن وہ اپنے کپڑے دھو رہا تھا جب اپنی جیب سے اسے اکبر کی صندل والی تسبیح ملی۔ اکبر ہمیشہ تسبیح پڑھتے وقت فخر سے بولتا۔

''میری تسبیح سے خوشبو آتی ہے۔'' پانی کا نل بند کیا۔ اس کی آنکھیں نم پڑ گئیں۔ اس تسبیح کو اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس رات وہ اس تسبیح کو لے کر بیٹھ گیا۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا۔ اکبر ان تسبیح کے دانوں پر کیا پڑھتا تھا۔ اسلامی عبادات سے وہ دور دور تک ناواقف تھا۔ بس اسے پہلا کلمہ آتا تھا۔ جو شاید اسے رحمت خان نے یاد کروایا تھا۔ آج اسے اتنی دیر بعد رحمت خان بھی بہت یاد آئے۔

اس جیل میں وہ سولہ سال سے اوپر کا ہو گیا تھا۔ اسے تو وضو بھی کرنا نہیں آتا تھا۔ کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جیسے بھی آتا تھا اٹھ کر وضو کیا۔ اپنی جگہ پر واپس آ کر آلتی پالتی مار کر

بیٹھا۔سب بچے سو رہے تھے۔

تسبیح کو اپنی جیب سے نکالا۔اسے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پکڑا۔تیمور نے آج اپنی زندگی میں پہلی بار تسبیح کے پہلے دانے پر پہلا کلمہ پڑھا۔گہری سانس لی۔دل تیزی سے دھڑکا۔دیوار کی پشت سے ٹیک لگائی۔اپنی آنکھ بند کیں۔اپنی انگلی تسبیح کے دانوں پر پھیرتا رہا۔پہلا کلمہ پڑھتا رہا۔اس کے لب دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

اپنی زندگی میں یہ اس کی پہلی عبادت تھی۔اس نے روزے بھی کبھی نہیں رکھے تھے۔جیل میں جب رمضان کا مہینہ آیا۔اس نے کوئی نہ روزہ رکھا۔عید والے دن جب کچھ قیدی بچوں سے ان کے گھر والے ملنے آئے تب اسے بہت تکلیف ہوئی۔

اسے اس بات کا شدید پچھتاوا تھا۔وہ اپنے باپ سے آخری بار گلے نہیں ملا تھا۔اپنے باپ کے آخری الفاظ اکثر اسے یاد آتے۔

”جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔اس ہی سے اپنی زندگی کو سنوارنا اور جو تمہارے ہاتھ میں نہیں،اس کے پیچھے مت بھاگنا۔“

جیل میں اپنے پاپا کے آخری الفاظ ہی اسے ہمت دیتے۔وہ اپنی ہر بات اپنے والد سے منواتا تھا۔اپنے والد کی کوئی بات نہیں مانتا تھا۔بس یہی وہ الفاظ تھے جن پر وہ عمل کر رہا تھا۔

اب اکثر رات جب سب سو جاتے تب وہ تسبیح پڑھتا۔تسبیح پڑھنے سے دل کو سکون ضرور ملتا تھا۔اسے یاد آتا کیسے وہ سب کو کہتا کہ وہ اپنی پلاننگ سے چلتا ہے۔وہ سب سے بلند بلڈنگ پر اپنا فلیٹ لے گا۔وہ سب سے اونچا ہوگا۔اور آج کسی کو اس کی پرواہ تک نہیں۔اتنے سالوں میں کوئی یہ پتا کرنے نہیں آیا وہ زندہ ہے کہ مر گیا ہے۔

تسبیح پڑھنے کے بعد وہ اللہ سے دعا مانگتا۔اسے بس اپنے باپ کے قاتلوں کو پکڑنا تھا۔

اکبر کے بعد وہ گونگا بن گیا تھا۔ بالکل خاموش۔ وہ نہ روتا، نہ ہنستا بس ایک زندہ لاش بن چکا تھا۔ کبھی کبھی سارا دن لوہے کی سلاخوں کو گھورتا رہتا۔ شہزادوں جیسی زندگی جینے والا آج غلاموں سے بدتر زندگی جی رہا تھا۔

''تم اٹھارہ سال کے ہو گئے ہو۔ اس لیے تمہیں اب بڑوں کی جیل میں بھیج رہے ہیں۔''

یہ نیا جیل سپرنٹنڈنٹ تھا۔ ویسے تو وہ اچھا بولتا تھا پر ایک نمبر کا رشوت خور تھا۔

''کب جانا ہے؟'' تیمور کرسی پر بیٹھا تھا۔

''کل صبح تمہیں اس جیل میں بھیج دیں گے۔ آج تمہیں کچھ پیپرز پر سائن کرنے کے لیے بلایا ہے۔ تمہارا میڈیکل چیک اپ بھی ہوگا۔'' کچھ سرکاری پیپرز اس کے آگے رکھے۔

تیمور نے ایک نظر ان پر ڈالی اور ان پر اپنے دستخط کر دیے۔ اس کے بعد اس کا ڈاکٹر نے میڈیکل چیک اپ کیا۔

''تمہیں اس جیل میں چار سال ہوں گئے ہیں۔'' جیل سپرنٹنڈنٹ نے پیپرز کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ''میری تمہیں ایک نصیحت ہے۔ اس جیل کو اس جیل جیسا مت سمجھنا۔ وہاں پیشہ ور مجرم ہوں گے۔ تم ابھی عمر میں بہت چھوٹے ہو۔''

وہ واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا جسے وہ یاد رکھنا چاہتا تھا، سوائے اکبر کے۔ اتنی کڑوی یادوں کو بھول جانا بہتر ہے۔ جیل میں پہلے دن اور آخری دن میں کچھ فرق نہیں تھا۔

اسے اگلے دن دوسری جیل میں بھیج دیا۔ یہ جیل اس جیل کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔ یہاں بھی جگہ کم اور قیدی زیادہ تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے کچھ سرکاری کارروائی کے بعد اسے اس کے سیل بھیج دیا۔

اس کے سیل میں پہلے سے تینوں ہٹے کٹے بڑی عمر کے مجرم تھے۔ایک کا قد بہت لمبا تھا۔ اسے تو دیکھتے ہی خوف آتا تھا۔تیمور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔وہ تینوں اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی روسٹ مرغی ہو۔

"کس جرم میں آیا ہے۔"ایک نے سوال کیا۔

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا بس خاموش رہا۔وہ تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔وہ کسی اور زبان میں بات کر رہے تھے۔اس رات وہ کونے میں ہی سمٹ کر لیٹ گیا۔رات کو اچانک اس کی آنکھ شور کی آواز سے کھلی۔کوئی بہت برے طریقے سے چیخ رہا تھا۔

"اوے سو جا، کسی کی ٹھکائی ہو رہی ہوگی۔"وہ لمبا قد کا شخص جمائی لیتے ہوئے بولا۔

اس رات خوف کے مارے اسے نیند نہیں آئی۔ایسی آوازیں اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔اس جیل میں اسے پانچ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ادھر نہ وہ ٹھیک سے سو پاتا نہ ٹھیک سے کھا پاتا۔تسبیح اب وہ باقاعدگی سے پڑھنے لگا تھا۔وہ لمبے قد کا مجرم اس پر ایک دو بار اپنا ہاتھ بھی اٹھا چکا تھا۔وہ مجرم اکثر اس سے اپنا کام بھی کرواتے۔اس کے پاس اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے لڑائی مول لیتا۔

اس جیل سپرنٹنڈنٹ نے ٹھیک کہا تھا۔اس جیل کو اس جیسی جیل مت سمجھنا۔ادھر وہ دو تین بار شکایت بھی کر چکا تھا پر سنا کس نے تھا۔اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔

اس دوپہر وہ زمین پر بیٹھ کر ان مجرموں کے کپڑے دھو رہا تھا۔سخت سردی کے دن تھے۔ وہ بنا چپل کے پانی کھول کر بیٹھا تھا۔سردی سے بچنے کے لیے ایک پرانا سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ کپڑے نچوڑ رہا تھا۔جب ایک جانی پہچانی آواز کان سے ٹکرائی۔ان کپڑوں کو چھوڑ کر آس پاس نظر دوڑائی۔ایک آشنا چہرے پر نظر پڑی۔وہ کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ایک

پولیس والا اس کے پاس ادب سے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ دوسرا پولیس والا اس کے لیے نان اور حلوہ لایا۔

تیمور کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کپڑے ادھر ہی چھوڑ کر اس شخص کے پاس بھاگ کر پہنچا۔

''سر! مجھے پہچانا۔'' وہ تقریباً اس شخص کے قدموں میں گر گیا۔ پولیس والے نے فٹ سے اسے پیچھے دھکیلا۔

''کہاں آ رہا ہے جا یہاں سے۔'' پولیس والے نے اسے ڈانٹ دیا۔

تیمور اٹھ کر اس شخص کے سامنے کھڑا ہوا۔

''ہم ملے تھے۔'' اس نے چائے پینے والے شخص کو یاد دلایا۔

''ایک منٹ رُکو۔'' اس نے پولیس والے کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ دانت کمزوری کی وجہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ اور پیر ایسے تھے جیسے کسی مزدور کے ہوں۔ کمر اس کی ذرا جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خوف اور درد تھا۔

''میں تمہیں نہیں جانتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

تیمور نے اسے یاد دلانے کی پوری کوشش کی۔ جب اس نے انکار کر دیا تو اس جیل وارڈن نے اسے زبردستی واپس بھیج دیا۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے واپس چلا آیا۔ ایک دو بار مڑ کر اس شخص کو دیکھا جو اس پولیس والے سے اپنی باتوں میں مگن تھا۔

بڑی ہمت کر کے کپڑے دھوئے۔ اس کا دل برے طریقے سے ٹوٹ گیا۔ اپنے سیل میں واپس آ کر بیٹھا۔ بخار سے اس کا جسم تپ رہا تھا۔

''میرے پیر دبا دے۔'' وہ لمبے قد والا مجرم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔اس کا اتنا رعب تھا کہ تیمور اس کے پیر دبانے لگا۔بخار اور بھوک سے اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

''تیرے میں جان نہیں ہے۔'' پہلے والا غرایا۔پھر بڑے پیار سے تیمور کے گالوں کو چھوا۔ اب وہ اتنا بچہ بھی نہیں تھا۔فوراً جھٹکے سے پیچھے ہوا۔اس نے آگے ہو کو تیمور کی کلائی پکڑ لی۔ باقی قیدی مزے سے ہنس رہے تھے۔تیمور زور سے چلایا، اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی۔اس سے پہلے وہ تیمور کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑتا۔جیل کا دروازہ کھلا، ایک رعب دار آواز پر اس نے اس لڑکے کو چھوڑ دیا۔

''چھوڑ دے اسے۔ورنہ ادھر تیری بوٹیاں بنا دوں گا۔'' وارڈن نے انہیں وارننگ دی۔

وہ سارے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''تو چل میرے ساتھ۔'' تیمور کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

تیمور ہانپتا کانپتا اس کے پیچھے چل پڑا۔وہ اسے دوسرے سیل لے گیا۔اس سیل میں وہ شخص تنہا بیٹھا تھا۔تیمور کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔اس کی اب بھی سانس پھولی ہوئی تھی۔

وارڈن وہاں سے چلا گیا۔

''پتر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔میں نے تجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔میں نے کسی وجہ سے تجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔''

تیمور ادھر ہی زمین پر بیٹھ گیا۔اتنی سالوں بعد اسے کوئی اپنا ملا تھا۔اس نے اپنے کندھوں سے شال اتار کر اس بچے پر ڈالی۔اسے کھانے کو نان اور حلوہ دیا۔تیمور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ایک ساتھ ہی چار نان کے ساتھ پورا حلوہ کھا گیا۔وہ ابھی بھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

وہ ڈھول والا خاموش بیٹھا رہا۔وارڈن کو کہہ کر چائے کے ساتھ پین کلر منگوائی۔وہ وارڈن

اسے پانچ منٹ کے اندر لا کر دے گیا۔ آج سالوں بعد اس نے چائے پی۔

''تجھے بخار ہے یہ گولی کھا لے۔ صبح بات کریں گے۔'' وہ پین کلر اسے کھلا دی۔ تیمور ادھر ہی گرم شال لے کر لیٹ گیا۔

''گدے پر سو جا۔ میری خیر ہے۔''

''آپ جاؤ گے تو نہیں۔'' اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

''نہیں ابھی ادھر ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا جادو تھا۔ تیمور سالوں بعد سکون سے لیٹ گیا۔ دوا کا اثر تھا اور تکلیف بھی بہت تھی۔ وہ جلد ہی سو گیا۔

''آپ اسے کیسے جانتے ہیں۔''

''بس ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ پر یقین نہیں آتا یہ وہی بچہ تھا۔ ٹھنڈے فرش پر ہی سو گیا۔ کس جرم میں آیا ہے؟'' ڈھول والے کی نظریں شال اوڑھے لڑکے پر تھیں۔

''مجھے صرف اتنا معلوم ہے بچوں کی جیل سے آیا ہے۔ وہاں کافی سالوں سے تھا۔ یہ جیلیں انسان کو اندر سے بھی پتھر بنا دیتی ہیں۔ اس لیے ٹھنڈے فرش پر لیٹ گیا۔'' وارڈن کندھے اچکا کر بولا۔

''ٹھیک ہے کیا یہ آج رات ادھر سو سکتا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے آپ سر کے مہمان ہیں۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔''

وہ وارڈن وہاں سے چلا گیا۔ ڈھول والا گدے پر لیٹ گیا۔ وہ ابھی تک حیران تھا۔ جو کسی سے لنگر لینا پسند نہیں کر رہا تھا۔ اپنی زندگی کو پرفیکٹ مانتا تھا۔ وہ آج اس حال میں ہے۔

صبح فجر کے وقت نماز سے فارغ ہوا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کر رہا

تھا۔ تلاوت کی آواز سن کر تیمور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈھول والا اپنی آنکھیں بند کر کے تلاوت میں مگن تھا۔

''آپ قرآن مجید کے بغیر کیسے پڑھ رہے ہیں۔ قرآن پاک کہاں ہے۔''

تلاوت مکمل ہوتے ہی تیمور نے فٹ سے پہلا سوال کیا۔

''قرآن پاک میرے سینے میں ہے۔ میں اس ذات کے کرم سے حافظ قرآن ہوں۔'' اپنے ہاتھ سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم بتاؤ اب کیسے ہو؟''

''آپ کے سامنے ہوں۔'' گرم شال اوڑھے اکڑوں بیٹھا تھا۔ ''وقت نے ایسا قہر ڈالا میری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ اب تو بس مر کے سکون ملے گا۔''

''مجھے حیرت ہوئی تمہارے منہ سے ایسی باتیں سن کے۔ وقت نے قہر ڈالا ہے تو یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ اور آنے والا وقت نئی صبح لے کر آئے گا۔ پتر! وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔'' اپنا رخ اس کی طرف کر کے آلتی پالتی مار کر بیٹھا۔

''آپ سوچ بھی نہیں سکتے، مجھ پر کیا بیتی ہے۔ میں نے کیسا وقت دیکھا ہے۔ مجھ پر۔ مجھ پر میرے والد۔ کے۔ قتل۔ کا الزام لگا ہے۔'' رک رک کر بولا۔ اس کی نظریں اب بھی بند سلاخوں پر تھیں۔ ''میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

''ہوں۔ اللہ تو ہے۔ وہ تو سب کا رب ہے۔ وہ تو رب العالمین ہے۔''

''میں ساری زندگی یہاں نہیں گزار سکتا۔ کیا اللہ میری مدد کرے گا۔''

''کیوں نہیں وہ ضرور کرے گا۔ تم اس سے مانگ کر تو دیکھو۔''

''کیا آپ مجھے وضو کرنا سکھائیں گے۔ مجھے تو نماز پڑھنا بھی نہیں آتا۔ میں نے کبھی روزے بھی نہیں رکھے۔ مجھے قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ میں نے سب کو تکلیف دی ہے۔ مجھ سے

کوئی بھی خوش نہیں۔سب کا دل دکھایا ہے۔پر اپنے پاپا کا قتل۔" پہلی بار کسی کے سامنے رو پڑا۔آنسو بہا بہا کر رو دیا۔

ڈھول والا خاموش ہو گیا۔اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے دی۔وارڈن کو آواز دے کر ناشتے کے لیے کہا۔

"جب بندے کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے تو اللہ بھی انہیں معاف کر دیتا ہے۔پتر! اللہ قرآن پاک میں فرماتا ہے جو شخص توبہ کر لیتا ہے۔اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔اور جب کوئی سچے دل سے اسے پکارتا ہے تو وہ اس کی فریاد ضرور سنتا ہے۔اللہ کسی بندے پر اتنی مشکل ڈالتا ہے۔جتنی وہ برداشت کر سکتا ہے۔" وہ بڑے پیار اور دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے۔

وارڈن ناشتہ رکھ کر چلا گیا۔ڈھول والا اپنی جگہ پر کھڑا ہوا۔

"آؤ میرے ساتھ۔پہلے وضو کرنا پھر ناشتہ کرتے ہیں۔" اسے اپنے ساتھ لے گیا۔اسے وضو کرنا سکھایا۔واپس آ کر دونوں ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ناشتے میں پراٹھے اور فرائی انڈے تھے۔

"آپ یہاں کیسے۔آپ نے کیا جرم کیا ہے۔"

"ناشتہ کرو۔" ایک پراٹھا اس کے آگے رکھ دیا۔"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔بس ایک جگہ شادی تھی وہاں ڈھول بجا رہا تھا۔شادی پر نا جانے کیا ہوا۔پولیس نے چھاپہ مار دیا۔مجھے بھی پکڑ کر لے آئے۔" ہنستے ہوئے نوالہ لیا۔

"آپ ہنس رہے ہیں۔پولیس والوں نے آپ کو کچھ نہیں کہا۔"

"اللہ نے مصیبت میں ڈالا ہے تو نکال بھی لے گا۔اور پولیس والے مجھے اس لیے کچھ نہیں کہہ رہے۔کیوں کہ یہاں کا ایس ایس پی میرے گاؤں کا ہے۔میرا بہت اچھا دوست ہے۔"

"آپ کب جیل سے جائیں گے۔" اپنی انگلیوں کا آپس میں مسلا۔

"ابھی تو ادھر ہوں۔ تم یہ چھوڑو پہلے ناشتہ کرو پھر تمہیں قرآن مجید پڑھنا سکھاؤں گا۔ نماز اور قرآن پڑھو گے نا۔ یہ بتاؤ تمہارے دل میں یہ خیال کہاں سے آیا۔"

تیمور نے فوراً ہاں میں سر ہلایا۔ انہیں اکبر سے اپنی دوستی کی ساری کہانی بیان کی۔ اپنی جیب سے صندل کی تسبیح نکال کر دکھائی۔

"تم نے وارڈن کی پٹائی کر دی۔ ہاہاہا۔ بڑے بہادر ہو۔"

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ کہتا تھا میری امی مجھے پھول کہتی تھیں۔ مرنے سے پہلے کہتا تھا اچھا ہو یہ پھول کانٹا لگنے سے پہلے ہی مرجھا جائے۔ مطلب۔" پراٹھے کا نوالہ لیا۔

"پتر! ہو سکتا ہے وہ کہنا چاہتا ہو۔ تم اپنی مثال لے لو۔ جیسے تم امریکہ جانا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے تم وہاں جا کر کسی اور بڑی مشکل میں پھنس جاتے۔ یا تم دنیا میں اتنا کھو جاتے کہ اپنی آخرت بھلا بیٹھتے۔ اللہ نے تمہیں اس مشکل میں ڈال کر تمہیں بچا لیا۔ بس اکبر بھی یہی کہنا چاہتا تھا اس سے پہلے وہ کوئی کانٹا بن جاتا کسی کو تکلیف دیتا۔ اللہ نے اسے بچا لیا۔" اپنا ناشتہ ختم کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

تیمور کا حیرت سے منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے بھی ناشتہ ختم کر کے اللہ کا دل میں شکر ادا کیا۔

"ایک بات بتا پتر۔ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم اس دربار پر چائے پینے کیوں آتے تھے۔"

"میری امی جو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ اس دربار پر حاضری دینے جاتی تھیں۔ پر میری کبھی ہمت نہیں ہوئی اندر جانے کی۔" شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"تم جیل میں کب سے ہو؟ کس نے تمہاری ایف آئی آر درج کی تھی۔ کیا ہوا تھا؟"

کل والا وارڈن اس سیل میں ڈھول والے کے پاس آیا۔

تیمور نے انہیں سارا واقعہ بیان کیا۔کس طرح اس رات وہ امریکہ جانے لگا تھا۔اپنے والد کے ساتھ بیٹھ کر ڈنر کیا۔جب وہ ہاتھ دھوکو واپس آیا تو اس کے والد کو کسی نے شوٹ کر دیا تھا۔تب سے وہ جیل میں ہے۔ابھی اس کی سوتیلی ماں اور بھائی کہاں ہیں اسے کچھ پتا نہیں۔

''اگر قتل تم نے نہیں کیا تو تم کو کس پر شک ہے؟''وارڈن نے اس سے پوچھا۔

''میری سوتیلی ماں کے بھائی ثاقب بیگ نے۔''اس نے یقین سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا یہ قتل اس نے کیا ہے۔''

اس نے انہیں بتایا کیسے وہ اس کو گن تحفے میں دے کر گیا تھا۔اور جب وہ اپنے والد کی لاش کے پاس بیٹھا تھا۔وہ گن وہاں پر کیسے آئی اسے نہیں پتا۔ڈی ایس پی آفتاب نے پہلے سے طے کر لیا تھا وہی قاتل ہے۔

''مجھ سے جو ہو سکا میں باہر جا کر تمہارے لیے ضرور کروں گا۔مجھے یقین ہے تم نے یہ قتل نہیں کیا۔''

ڈھول والے کی بات سن کر تیمور اس کا منہ تکتا رہ گیا۔یہ پہلی بار تھا جب کسی نے اسے بے قصور کہا تھا۔نہ جانے کیوں وہ اس کے گلے لگ گیا۔وارڈن بھی وہاں سے چلا گیا۔

وہ پورا ہفتہ تیمور کو نماز کے ساتھ قرآن سکھاتا رہا۔اس نے سب کچھ بہت دل لگا کر سیکھا۔ ڈھول والے نے یہ بات محسوس کی وہ لڑکا اندر سے پتھر بن گیا ہے۔وہ بہت بے حس ہو گیا ہے۔جس ماحول میں وہ رہا ہے۔اس نے اسے کٹھور بنا دیا ہے۔اس کٹھور پن کی وجہ سے اس کی آگے آنے والی زندگی میں اور تکلیفیں آ سکتی ہیں۔

ایک ہفتے بعد ڈھول والا وہاں سے چلا گیا۔تیمور اس کے جاتے وقت اس کے گلے لگ کر

روپڑا۔اس سے وعدہ کر کے گیا۔وہ اس کے لیے ضرور کچھ کرے گا۔

"شاید تیری رہائی کا وقت آ گیا ہے۔تبھی اللہ نے مجھے تیرے لیے بھیجا ہے۔بس اب تم نے نماز نہیں چھوڑنی۔اور اب تمہیں یہاں کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا۔"

وہ جاتے ہوئے اسے پیار کر کے گیا۔اپنے وعدے کے مطابق وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا۔اور ہر وقت باوضو رہنے لگا۔

☆......☆......☆

سب سے پہلے اٹھ کر وضو کیا۔باہر ابھی اندھیرا تھا۔اس کے کمرے کی لائٹ بند تھی۔موم بتی جلا کر کمرہ روشن کیا۔تہجد کی نماز ادا کی۔تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کی۔وہ سجدے میں جھکی۔سجدے کی حالت میں بندہ اللہ کے سب سے قریب ہوتا ہے۔اپنے لیے دعا مانگی۔اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔عبادت تو کرتی تھی دعا مانگنا چھوڑ دیا تھا۔آج دعا بھی مانگی۔اس ذات کا شکر ادا کیا جس نے اسے چھت دی، کھانے کے لیے دیا، اس کی حفاظت کی، اسے صحت دی۔

دعا مانگنے کے بعد درود شریف کی تسبیح پڑھی۔سورج کی کرنیں اس کے کمرے کی کھڑکی سے اندر آئیں۔اس کا جائے نماز روشن ہوا۔موم بتی بجھا دی۔

جائے نماز تہہ کر کے چارپائی پر رکھی۔اپنے لیے چائے بنائی۔آج عرصے بعد وہ مسکرا رہی تھی۔کل رات کو یونیورسٹی میں کوئی فنکشن تھا۔وہاں سے کھانا لائی تھی۔صبح ناشتے میں وہی کھایا۔ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کپڑے بدلے۔اپنا جھاڑو لیا اور گراؤنڈ میں آ گئی۔بچے ہوئے روٹی کے ٹکڑے اپنے ساتھ لائی۔ان کو چڑیوں کو ڈال دیا۔

دن کا آغاز ہو گیا تھا۔سورج آسمان پر چمک رہا تھا۔گراؤنڈ کی صفائی کرنے کے بعد

ڈیپارٹمنٹ میں آئی۔ پروفیسر حلیمہ اس ہی کا انتظار کر رہی تھیں۔

''میڈم! کیا ہوا؟ کوئی کام تھا۔''

''ہاں تم صفائی کرنے کے بعد میرے آفس آنا مجھے تم سے کچھ کام ہے۔''

وہ یہ کہہ کر اپنی کلاس لینے چلی گئیں۔

نوری بی نے اپنا کام جلدی سے نمٹایا۔ اپنا ہر کام اچھے سے کرتی۔ اس کے کام سے کبھی کسی نے شکایت نہیں کی تھی۔ اپنا کام ختم ہونے کے بعد پروفیسر حلیمہ کے آفس میں جا کر بیٹھی۔

کلاس لینے کے بعد پروفیسر حلیمہ اپنے کیبن میں آئیں۔ رجسٹر میز پر رکھا خود نوری بی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''اور سناؤ کیسی ہو؟ اس دن کے بعد تم نظر ہی نہیں آئی۔'' اپنے دونوں بازو میز پر رکھے۔

''اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔''

پروفیسر حلیمہ نوری بی کے منہ سے اللہ کا شکر ہے سن کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔

''اللہ کرے تم ایسے ہی خوش رہو۔ وہ ذات تمہاری ہر نیک خواہش پوری کرے۔''

''میں نے اللہ سے دعا مانگنا شروع کر دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں وہی ذات سب کی دعائیں سننے اور پوری کرنے والا ہے۔''

''بیشک۔۔۔ میں نے تم کو اس لیے بلایا تھا۔ میں نے تم کو کسی سے ملوانا ہے۔ ایک عورت ہے تم کو اس کی کچھ ہیلپ کرنی ہے۔'' بیگ سے ایک کاغذ نکالا۔

''میں نے کسی کی مدد کرنی ہے۔ کون ہے وہ عورت۔'' حیرانگی اس کے چہرے پر صاف ظاہر تھی۔

"بتاتی ہوں۔تم نے ایک بار مجھے اپنے ایک کام کے بارے میں بتایا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔"

"بس اس ہی سلسلے سے متعلق تمہیں ایک عورت کی مدد کرنی ہے۔یہ اس کا ایڈریس ہے۔تم اس سے آج ہی مل لو۔تمہیں پتا ہے نا جو دوسروں کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔" کاغذ پر لکھا ایڈریس اس کے آگے رکھا۔

"میڈم! میں آپ کی بات نہیں ٹال سکتی۔اگر آپ کہہ رہی ہیں تو آج ہی مل لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ میں اس کو فون کر کے بتا دیتی ہوں۔"

نور بی بی وہ ایڈریس اپنے ساتھ لے آئی۔واش روم گئی فریش ہو کر آئی۔پروفیسر حلیمہ نے جو اس دن سوٹ لے کر دیا تھا۔وہی سوٹ زیب تن کیا۔بالوں کی چٹیا بنائی۔اپنی چادر اوڑھی، دیئے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہوئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اس گھر کے سامنے کھڑی تھی۔گیٹ کی بیل بجائی۔ایک زیادہ عمر کی عورت نے گیٹ کھولا۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔قمیض اور شلوار دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ان کپڑوں پر سلوٹیں تھیں۔

"تم نور بی بی ہو نا، اندر آ جاؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔مجھے حلیمہ نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔" اس کا لہجہ بہت نفیس تھا جو اس کے حلیے سے پورا مختلف تھا۔

نور ان کو سلام کر کے ان کے پیچھے اندر گئی۔گھر چھوٹا اور صاف ستھرا تھا۔گھر میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔وہ اسے کمرے میں لے گئیں۔کمرے میں ایک بیڈ اور دو لکڑی کی کرسیاں تھیں۔کمرے میں جگہ جگہ سے پینٹ اکھڑا ہوا تھا۔ایک الماری اسلامی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ کیا لو گی۔“

”کچھ نہیں مجھے واپس جانا ہے۔ہم پہلے کام کی بات کر لیں۔“ کرسی پر بیٹھی۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئیں۔

نور ادھر ہی بیٹھی رہی۔اس عورت میں کچھ تو عجیب تھا۔اس کی آنکھیں جیسے سوجی ہوں، ابھی ابھی روئی ہو۔

وہ عورت چائے بنا لا کر لائی۔ڈش میں دو چائے کے کپ کے ساتھ ایک چھوٹا سا کیک تھا۔

”لو یہ کیک کھاؤ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ کیک کا ایک ٹکڑا نور کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

”ان سب کی کیا ضرورت تھی۔چائے ہی کافی تھی۔آپ نے یونہی زحمت کی۔“ کیک کی پلیٹ پکڑ کر اپنی گود میں رکھی۔”میں پروفیسر حلیمہ کی بات نہیں ٹالتی۔مجھے آپ کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔آپ کون ہیں؟ کیا کام کرتی ہیں۔“

”حلیمہ میری بہت اچھی دوست ہے۔تم مجھے بھی میڈم کہہ سکتی ہو۔ساتھ میں کام کریں گے تو ایک دوسرے کو اچھے سے جان لیں گے۔“ چائے میں چینی ملا کر اس کے آگے رکھی۔

”آپ اس گھر میں تنہا رہتی ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے نور بی بی نے پوچھ لیا۔

”ہاں فی الحال تنہا رہتی ہوں۔تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا۔“ کیک کا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا۔

”ایسے ہی میں بھی اکیلی رہتی ہوں۔کچھ اپنا اپنا سا لگا۔ویسے کیک بہت مزے کا ہے۔“

”شکریہ۔مجھے تم بہت اچھی لگی ہو۔ایسا کرتے ہیں مل کر کام کرتے ہیں۔ابھی رقم میں لگاتی ہوں۔تم اپنا کام کرنا۔بعد میں ففٹی ففٹی میرا مطلب ہے۔جب ہمارا بزنس شروع ہو

جائے گا۔تو جو انکم ہو گی وہ ففٹی ففٹی کر لیں گے۔تم چاہو تو ادھر شفٹ ہو جاؤ میرے ساتھ۔"

چائے کا سپ لیا۔

"میڈم! آپ نے تو ساری پلاننگ ہی کر لی۔مجھے بھی آپ بہت اچھی لگی ہیں۔کیا ہم اس ہوٹل کے مالک سے مل سکتے ہیں؟ مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے وہ کام چھوڑے ہوئے۔پہلے ایک یا دو بار پریکٹس کرنی پڑے گی۔اگر ان کو میرا کام پسند آ جائے پھر انشاءاللہ مل کر کام کریں گے۔" چائے کا خالی کپ میز پر رکھا۔

"ہاں ابھی چلو میں برقعہ پہن کر آتی ہوں۔ہوٹل اس وقت کھلا ہو گا۔"

خالی برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔اپنا برقعہ پہن کر آئیں۔نوری بی ان کے ساتھ رکشہ پر اس ہوٹل پہنچی۔

"میرا اپنا ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہے۔ہوٹل میرا مری میں ہے۔میرے کام کی پہلی شرط ہے کہ مجھے کام صاف ستھرا اور ٹائم پر چاہیے۔میں امانت داری سے چلتا ہوں۔اور پوری امید رکھتا ہوں اگلا انسان بھی میرے ساتھ ویسا ہی چلے۔مجھے اپنے ریسٹورنٹ کا ایک اچھا معیار سیٹ کرنا ہے۔"

نوری بی اس عورت کے ساتھ اس شخص کے ہوٹل میں بیٹھی تھی۔وہ کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر تھا۔عمر زیادہ نہ تھی۔اس نے حال ہی میں اپنا ریسٹورنٹ کھولا تھا۔چیزوں کی کوالٹی اور صفائی کے معاملے میں بہت سخت تھا۔

"ہماری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔آپ بے فکر ہو جائیں۔ہم کل آپ سے ملاقات کریں گے۔اپنی پہلی ڈلیوری ساتھ میں لائیں گے۔" برقعہ پہنی عورت نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔نوری بی اس کے بات کرنے کے انداز سے حیران بھی ہوئی اور

متاثر بھی۔

"ٹھیک ہے اب ہم کل ملیں گے۔ میں آپ پر بھروسہ کرتا ہوں۔" فوجی افسر کے جاتے ہی وہ دونوں عورتیں بھی ہوٹل سے نکل آئیں۔

"پہلے مارکیٹ جا کر سامان لاتے ہیں۔ ابھی دوپہر ہوئی ہے تم میرے گھر چلو شام تک وہیں رہنا۔ تب تک تم اپنا کام کر لوگی۔"

نوری بی ان کے ساتھ مارکیٹ گئی۔ ضرورت کا سامان لے کر وہ واپس آ رہے تھے۔ جب سے اس نے یونیورسٹی میں ماسی کی نوکری شروع کی تھی۔ تب سے اب تک وہ دوسری بار یونیورسٹی سے باہر نکلی تھی۔ اتنے سالوں بعد باہر آ کر اسے کافی اچھا لگ رہا تھا۔ اور اسے بیٹھے بٹھائے ایک اچھا کام مل گیا تھا۔

رکشہ میں بیٹھی لڑکی اس سفر میں بہت خوش تھی۔ اس نے سب دنیا سے منہ موڑ کر اپنی سالوں سے ایک چھوٹی سی دنیا بسائی ہوئی تھی۔ راستے میں ان کا رکشہ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے رک گیا۔

کسی موٹر سائیکل والے کا برے طریقے سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس شخص کی دونوں ٹانگیں کچلی گئی تھیں۔ ایک بازو ٹوٹ کر تقریباً جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ سر سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ اس کی زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔

ادھر بھیڑ اکٹھی ہونے لگی۔ رکشہ والے نے بڑی مہارت سے فوراً رکشہ وہاں سے نکال لیا۔ ورنہ ٹریفک کی وجہ سے پھنس جاتا۔

وہاں سے رکشہ گزرتے وقت نوری بی کی اس شخص پر سرسری سی نظر پڑی۔ اس شخص کی شکل دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے ایک سیکنڈ سے پہلے اس شخص کو پہچان لیا۔ وہ وہی تو تھا۔

اللہ نے ایسی موت مارا۔وہ ادھر نہ صرف مر گیا بلکہ نور بی بی نے بھی اس کا انجام اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیا۔نور بی بی کے پسینے چھوٹ گئے۔

"توبہ کیسی موت مرا ہے۔"

"ہاں اللہ بچائے ایسی موت سے۔"

اس کے کانوں میں گزرتے ہوئے آواز پڑی۔"اللہ نے مجھے یہ منظر کیوں دکھایا۔کیوں اس شخص کا چہرہ مجھے یوں دیکھنے کو ملا۔"

وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔جب رکشہ گھر کے باہر رکا۔وہ رکشہ میں بیٹھی تھی۔

"نور! گھر آگیا ہے کہاں کھوئی ہوئی ہو؟"

میڈم کی آواز پر نور بی بی چونکی۔"میں اس ہی رکشہ سے یونیورسٹی چلی جاتی ہوں۔صبح جلدی آ کر کام شروع کر دوں گی۔آپ یہ سامان ادھر رکھ لیں۔"نور نے وہ شاپنگ والا سامان انہیں دے دیا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔کل وقت پر آجانا۔"

وہ سامان لے کر اپنے گھر چلی گئی۔نور بی بی اس ہی رکشہ پر اپنے گھر آگئی۔وہ اس ہی شخص کے بارے میں سوچتی رہی۔اپنا دن بھر کا کام روٹین کے مطابق کیا۔رات کو عشاء کی نماز ادا کی۔

آج بہت مہینوں بعد چارپائی کے نیچے سے اپنا لوہے کا صندوق نکالا۔اس صندوق کو کھولا،بہت سی پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔

"مجھے اب پرانا وقت نہیں یاد کرنا۔مجھے اب صرف اپنے آنے والے وقت کے بارے میں سوچنا ہے۔اتنے سالوں بعد جا کر اللہ نے مجھے ایک راہ دکھائی ہے۔"

اس صندوق سے اپنی ضرورت کا سامان لیا۔ اسے واپس بند کر کے چارپائی کے نیچے کر دیا۔ صبح جانے کے لیے اپنے کپڑے تیار کیے۔ جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اگلی صبح جلد نیند سے بیدار ہوئی۔ تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی۔ فجر کی نماز کے بعد آج پھر اللہ سے دعا مانگی۔ اپنا ناشتہ کیا اور اپنا جھاڑو لے کر گراؤنڈ میں آئی۔ وہاں کی صفائی کرنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آئی۔ فریش ہوئی کل والا سوٹ پہنا۔ اپنا سامان لیا اور اس عورت کے گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ سارا راستہ وہ کل والے شخص کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر سے یادوں کا طوفان اس کے دماغ میں چلنے لگا۔ پورے مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئی۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی تم پورے وقت پر آئی ہو۔''

''میں کام شروع کرتی ہوں۔ امید ہے سب صحیح رہے گا۔''

نور بی بی اس کے ساتھ مل کر دو گھنٹے کے اندر اپنا کام ختم کیا۔ اس دوران وہ کافی باتیں کرتے رہے۔ اچھے دوست بھی بن گئے۔ کام مکمل ہونے کے بعد اپنا تیار کیا ہوا سامان لیا اور پھر سے دونوں ہوٹل کے لیے نکل گئے۔

دن کے بارہ بج رہے ہوں گے۔ اس وقت ہوٹل میں زیادہ رش نہیں تھا۔ ہوٹل کے شیف اپنا کام شروع کر رہے تھے۔ دونوں اپنے سامان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ریٹائر افسر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

''کیا یہ کام آپ پہلے بھی کر چکی ہیں؟'' افسر نے بوتل کھول کر جام کھا لیا۔ ''مجھے آپ کا کام پسند آیا ہے۔ مجھے آپ دونوں کے اصلی ڈاکومنٹس چاہیے ہوں گے۔''

"میں نے جام بنانا اپنی آنٹی سے سیکھا ہے۔ میں یہ کام پہلے بھی کر چکی ہوں۔ یہ اس پورے کام کا بل ہے۔" اپنے بیگ سے ایک پرچی نکال کر میز پر رکھی اور ساتھ میں اپنے ڈاکومنٹس بھی۔

افسر نے وہ بل دیکھا پھر ڈاکومنٹس چیک کیے۔

"آپ کا نام ستارہ ہے۔ اور ابھی آپ یونیورسٹی میں صفائی کا کام کر رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ یہ کام کیوں کر رہی ہیں۔" ڈاکومنٹس میز پر رکھے۔

"میرا پرسنل مسئلہ ہے۔ اس کام سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں۔ باقی پیپرز بھی دیکھ لیں۔ مجھے ایک بار طلاق ہوئی ہے اور دوسری شادی سے میرا شوہر فوت ہو گیا تھا۔ پہلے طلاق یافتہ ہوئی پھر بیوہ اور کچھ جاننا ہے۔"

ستارہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ میڈم نے اپنے پاس بیٹھی لڑکی کو حیرت سے دیکھا۔ افسر نے اپنے سر کو خم کے انداز میں ہلایا۔

"مجھے آپ کے ساتھ یہ ڈیل منظور ہے۔ کل تک مجھے جام کی میرے ریسٹورنٹ کے لیے سو بوتلیں تیار چاہئیں۔ آپ یہ سمجھیں یہ آپ کی پہلی اسائنمنٹ ہے۔ اگر آپ اس میں کامیاب رہی تو انشاء اللہ ہم آپ کے ساتھ ہی کام کریں گے۔ آج آپ چائے پی کے جانا۔"

وہ افسر وہاں سے چلا گیا۔ ہوٹل کا ویٹر ان کے لیے چائے لے آیا۔

"تمہارا نام۔ نور۔"

"نہیں ستارہ۔ آپ حیران مت ہوں۔ میرا اصلی نام ستارہ ہے۔ زندگی ایسے بدلی مجھے میرا نام نور بی بی رکھنا پڑا۔" ستارہ نے چائے کا سپ لیا۔ "پتا ہے مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات سے ہوتی ہے۔ میرا خواب تھا میں کسی یونیورسٹی کی ڈین بنوں۔ پر آج اس ہی

یونیورسٹی میں ماسی کا کام کر رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ساتھ میں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"اپنی زندگی کی کہانی پھر سناؤں گی جو صرف ایک خط سے شروع ہوتی ہے۔ابھی چلتے ہیں بہت کام ہے۔"
"ہاں چلو۔خواب ٹوٹتے ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔"تم مجھے اپنی کہانی سنانا میں تم کو اپنی کہانی سناؤں گی۔واقعی وقت پلٹتے دیر نہیں لگتی۔" گہری سانس لی۔
وقت پلٹتے دیر نہیں لگتی یہ بات اس وقت واقعی سچ ثابت ہوئی۔جب وہ اس ہوٹل سے نکلنے لگے۔کاونٹر پر ستارہ۔نور بی بی کی نظر اخبار پر پڑی۔وہ آج کی اخبار تھی۔اس میں کل کے روڈ ایکسیڈنٹ کے بارے میں خبر دی ہوئی تھی۔
ستارہ نے فٹ سے وہ اخبار اٹھایا۔اس شخص کا نام اور خبر پڑھی۔وہ اس کے اور عینی کے سکول میں فزکس کے سر تھے۔خبر کے مطابق وہ سکول کے بچیوں کو ہراساں کرتا تھا۔ایک مجرم تھا جو ضمانت پر باہر تھا۔
ستارہ کے ہاتھ سے وہ اخبار نیچے گر گیا۔اسے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔اسے چکر آیا تو اس نے کاونٹر کا سہارا لیا۔
"اس کا مطلب عینی بھی۔اس کا شکار۔وہ مجھ سے کہتی تھی۔تبھی اس نے خودکشی۔۔"
پھر سے چکر آیا۔اس بار نیچے گرتے گرتے بچی۔
"کیا ہوا ستارہ۔تم ٹھیک ہو۔"
ستارہ کو ہوٹل میں کرسی پر بٹھایا۔اسے پانی پلایا۔
"سب ٹھیک ہے اچانک کیا ہوا۔تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔چلو گھر چلتے ہیں۔" وہ پاس والی کرسی پر بیٹھیں۔

''ہاں ٹھیک ہوں میڈم۔'' وہ بنا پلک جھپکائے بولی۔ ''اللہ نے انصاف کر دیا۔ اللہ عینی کی مغفرت فرمائے۔'' پورا پانی کا گلاس پیا۔ ''پہلے مارکیٹ چلتے ہیں۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔ ہماری پہلی ڈیل ہے ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔''

میڈم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ اس کے ساتھ چل دیں۔ دونوں وہاں سے مارکیٹ پہنچیں۔ وہ شیشوں کی بوتلوں کی دکان پر کھڑی جام کی بوتلیں خرید رہی تھیں۔

''پوری سو بوتلیں چاہئیں۔ دھیان سے ڈھکن بالکل ٹھیک ہوں۔ کسی بھی بوتل پر کریک نہ ہو۔ ہمیں یہ بوتلیں ابھی چاہئیں۔''

ستارہ نے دکاندار کو اپنا سامان لکھوایا۔ میڈم نے بل ادا کر دیا۔ وہ ایک ایک بوتل کو خود چیک کر کے پیک کروا رہی تھیں۔ اپنا سامان لینے کے بعد دونوں پچاس پچاس بوتلیں لے کر باہر آئیں۔

''اب ہم تازہ سیب لے لیتی ہیں۔ چینی گھر کے پاس سے خرید لیں گی۔'' میڈم نے ایک فروٹ شاپ کی طرف اشارہ کیا۔

''فروٹ شاپ سے فریش ایپل مل جائیں گے۔ ایپل لے کر سیدھا گھر چلتے ہیں۔'' اس کا اب بھی چہرہ اترا ہوا تھا۔

وہ دونوں فروٹ شاپ سے ایپل خرید رہی تھیں۔ جب ستارہ پر ایک اور دھماکہ ہوا۔ اس کے بھائی حسن کی نظر اس پر پڑی۔ وہ بائیک پر تھا اس نے ادھر سے ہی اسے چلا کر آواز دی۔

''ستارہ۔ ستارہ۔'' اس کی آواز پر لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔ خود ستارہ نے بھی حیران ہو کر مڑ کر دیکھا۔ میڈم بھی حیران و پریشان تھیں۔

وہ حسن ہی تھا۔ کافی بڑا اور ہینڈسم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بائیک سے اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا

اس کے پاس پہنچا۔اس کے منہ سے نکلے الفاظ سے وہ اور حیران رہ گئی۔

''تم۔ستارہ۔۔زندہ۔ہو۔''اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز میں درد اور تکلیف تھی۔''تم یہاں۔''

وہ ایک کرکٹر تھا وہاں کھڑے لوگ اسے دیکھ کر خوش ہوئے۔ستارہ نے چہرے کو دوپٹہ سے کور کیا۔

''میڈم چلیں۔''سیبوں کا شاپر ہاتھ میں لے کر وہاں سے چل پڑی۔میڈم اس سیب والے کو پیسے دے کر اس کے پیچھے آئیں۔حسن بھی ان کے پیچھے آیا۔ستارہ تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

''ستارہ، رکو۔''میڈم اور حسن نے اکٹھی آواز لگائی۔بازار کی اس گلی میں زیادہ رش نہ تھا وہاں رکی۔

''میری سانس کیوں سکھا رہی ہو۔مجھ بڑھیا کا خیال کر لو۔''میڈم ہانپتی کانپتی بند دکان کے آگے بیٹھ گئیں۔سامان اپنے پاس زمین پر رکھ دیا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہیں، اب کیوں آئے ہو؟''اپنے ہاتھوں میں دونوں شاپروں کو مضبوطی سے تھاما۔

''تم زندہ ہو۔''پھر سے وہی الفاظ دوہرائے۔''ہمیں لگا تم۔''وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا لگا گھر سے بھاگ گئی ہوں اپنے شوہر کو قتل کر کے۔''

حسن اپنا سر پکڑ کر زمین پر پیروں کے بل بیٹھا۔پھر کھڑا ہوا گہری سانس لی۔

''جب تکلیف میں تھی تب تو مجھے پوچھا نہیں۔اب کیوں حق جتانے آ گئے ہو۔میڈم چلیں یہاں سے۔''اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔رکشہ والے کو آواز دی۔وہاں سے چل دی

پر حسن نے جیسے امی کا نام لیا ادھر رک گئی۔اس کی پشت کے پیچھے حسن کھڑا تھا۔میڈم اب بھی دکان کے آگے بیٹھی ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"ستارہ! تمہیں پتا ہے امی کس حال میں ہیں۔" حسن چیخا پھر آواز دھیمی رکھی۔"ہم کو اس سندس کی بچی اور اس کے فرمانبردار شوہر نے کہا تھا تمہارا ا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور تم اس دنیا میں۔۔۔" اس نے آگے کے الفاظ ادا نہیں کیے۔شاید ہمت نہیں ہوئی۔"تم تو ہم سے رابطہ کر سکتی تھی۔گھر چلو ایک بار امی سے مل لو۔اس سلیم کے بچے کو بعد میں دیکھ لوں گا۔"

"مجھے گھر نہیں جانا کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔تم چلے جاؤ یہاں سے۔اپنے وہ ہوتے ہیں جو مصیبت میں ساتھ کھڑے رہیں۔" اس کے الفاظ طنز بھرے تھے۔وہ رکشے میں جا کر بیٹھ گئی۔

حسن اسے روکنے لگا پر میڈم نے اس کو بازو سے پکڑا۔

"یہ میرا فون نمبر ہے۔تم مجھے فون کر کے ایڈریس لے لینا۔ابھی وہ بہت تکلیف میں ہے۔میں اس کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" کاغذ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور خود جا کر رکشے میں بیٹھ گئیں۔

حسن نے اس کاغذ پر لکھے نمبر پر نظر ڈالی۔اسے اپنی جیب میں رکھا۔اس وقت اس کے اندر طوفان مچا ہوا تھا۔ایک طرف خوشی تھی۔اس کی چھوٹی بہن زندہ تھی۔دوسری طرف اپنے سگے بھائی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔اپنی بائیک پر جا کر بیٹھا،اور وہاں سے نکل گیا۔

گھر پہنچ کر ستارہ نے سب سے پہلے ظہر کی نماز ادا کی۔اور پھر ایپل جام بنانے میں لگ گئی۔میڈم اپنے گھر کے دوسرے کاموں میں لگ گئیں۔تقریباً عصر کی نماز کے وقت جام تیار ہو گیا۔دونوں نے مل کر جام کی بوتلوں کو بھرنے لگیں۔ان بوتلوں کو بھرنے کے بعد سلیقے سے

فریج میں رکھ دیا۔

''پلیز چائے پی کر جانا۔میں نے آج چاکلیٹ کیک بنایا ہے۔''

ستارہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا۔وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد وہ چائے کے ساتھ کیک لے آئیں۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔تم ابھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہو۔پر میں تم سے عمر میں بہت بڑی ہوں۔''گرم چائے کا کپ اس کے آگے رکھا۔''مجھے نہیں پتا تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔بس صرف ایک بار اپنی ماں سے مل لو۔''

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی کیا کروں۔روؤں یا اللہ کا شکر ادا کروں۔ایک طرف وہ کمینہ فزکس کا سر اس کا سچ آج ہی سامنے آیا۔اور دوسری طرف میری فیملی۔''اس کی نظریں چائے کے کپ پر اڑتی بھاپ پر جمی تھیں۔''وقت کیسے گزر جاتا ہے اور پھر سے پلٹ کر کیسے واپس آ جاتا ہے۔''

''میں نے تم سے پوچھے بغیر اپنا نمبر تمہارے بھائی کو دے دیا ہے۔ابھی تم بہت تکلیف میں مبتلا ہو۔پر میرا یقین کرو اپنوں سے مل کر تمہیں بہت اچھا لگے گا۔''

ستارہ نے انہیں مختصراً اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔جب رفیق کی موت کے بعد وہ عدت گزار کر اپنے گھر آئی تو سندس نے کس طرح اسے گھر سے نکال دیا۔اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔بڑی مشکل سے وہ اپنی دادی اماں کی نرس سے ہسپتال میں جا کر ملی۔

اس نے اسے واپس اپنے سسرال جانے کا مشورہ دیا۔پر رفیق کے بعد اس گھر میں اس کی کوئی جگہ نہ تھی۔اس لیے نرس سے ہی مدد مانگی۔وہ دو راتیں وہ چھپ کر اسی ہسپتال میں رہی۔اور کسی طرح کر کے اس نرس نے اسے یونیورسٹی میں ماسی کی نوکری لگوا دی۔

اس نے اپنے کسی گھر والے سے رابطہ نہیں رکھا۔وہ نہ اخبار پڑھتی تھی اور نہ ٹی وی دیکھتی

تھی۔اسے پتا ہی نہیں تھا اس کے بھائی کا کرکٹر بننے کا خواب پورا ہو گیا ہے۔اس نے بھی ایک خواب دیکھا تھا۔پر اس کا خواب شاید الٹا پڑ گیا۔

''ہم کل جام کی ڈیلیوری دینے جائیں گے۔ابھی میں چلتی ہوں۔'' وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

''میرے کہنے پر ایک بار مل لو۔اپنوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔''

''آپ کی فیملی کہاں ہے؟ آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتی۔آپ باڈی لینگویج سے غریب تو نہیں لگتیں۔''

ستارہ نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس عورت کا بغور جائزہ لیا۔

وہ عورت ہنس پڑی۔''ادھر میرے ساتھ ہی ہے۔بہت جلد تمہیں ملواؤں گی۔تم بس اپنا دھیان رکھنا۔ایک بات کہوں۔تم نے کہا تم نے دوسری شادی اپنی مرضی سے کی تھی۔آگے شاید تمہاری قسمت میں یہی لکھا تھا۔اس میں تمہارے گھر والوں کا کیا قصور۔تمہاری جو بھی سنڈس بھابھی اور بھائی ہیں۔انہوں نے تمہیں گھر سے نکالا۔تمہارے گھر والوں کو تمہارے بارے میں جھوٹ بولا۔تمہارے گھر والوں نے جو بھگتنا تھا بھگت لیا۔اللہ معاف کر دیتا ہے تو ہم انسان کیا چیز ہیں۔''

''اگر میرے گھر والے میری پہلی غلطی کو معاف کر دیتے تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔''

''ٹھیک کہتی ہو پر ہر انسان نے اپنی زندگی کی تکلیفیں کاٹنی ہیں۔شکر کرو تم سنبھل گئی۔تمہیں در بدر کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں۔اس ذات نے تمہیں سمیٹ لیا۔''

ستارہ ان سے اجازت لے کر رکشہ میں بیٹھ کر واپسی کے لیے نکلی۔شام ہو رہی تھی۔آسمان بہت پیارا لگ رہا تھا۔ٹریفک کا شور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ہوا سے اس کے چہرے پر

آئے بال اڑ رہے تھے۔

”حسن کتنا بڑا ہو گیا ہے۔اس نے اپنا خواب پورا کر لیا۔چلو کوئی تو خوش ہے۔آج عینی کی خودکشی کی وجہ سامنے آ گئی۔تو سندس اور سلیم نے یہی کہا کہ میں مر گئی ہوں۔اور انہوں نے یقین کر لیا۔وقت کیسے گزر جاتا ہے۔کاش میں واقعی وہ خط نہ لکھتی۔ایک فردوس بھی تھا۔کاش وہ ہی میرا خط میرے گھر والوں کو نہ دیتا۔کاش میرے بابا زندہ ہوتے۔وہ میری وجہ سے۔۔۔“

اپنے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے فوراً پونچھ لیا۔یونیورسٹی پہنچ کر پہلے کینٹین آئی۔اپنے لیے کھانے کے لیے نان اور حلیم لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔کھانا کھایا،عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد بستر پر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

”مجھے اپنی امی سے تو ملنا ہے۔نہ جانے کس حال میں ہوں گی۔اور اسد بھائی انہوں نے امریکہ جانے کے بعد کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔اب ان کو بھی میری فکر ہو رہی ہے۔“

اگلے دن وہ میڈم کے ساتھ جام کی ڈلیوری دینے گئی۔ہوٹل کے مالک ریٹائرڈ فوجی افسر کو ان کا کام بہت پسند آیا۔ان دونوں کو ان کا پہلا چیک ملا۔رقم کافی اچھی تھی۔

”جیسے کہ میں نے کہا تھا۔ففٹی ففٹی۔“ میڈم بہت خوش تھیں۔

”یہ نا انصافی ہو گی۔ساری رقم آپ نے لگائی تھی۔میں نے تو ذرا سی محنت کی تھی۔“

”میں زبان کی پکی ہوں۔اور کیا محنت کرنا کچھ نہیں ہوتا۔میں بنک میں پیسے جمع کروا دوں گی۔اور تم اپنے حصے کی رقم لے لینا۔بلکہ تم بھی اپنا اکاؤنٹ کھول لو۔آسانی رہے گی۔“

آج دونوں بہت خوش تھیں۔ان کی محنت رنگ لائی۔میڈم اس کو اس ہی ہوٹل میں لے کر بیٹھ گئیں۔دراصل میڈم نے ستارہ کے گھر والوں کو وہاں بلایا تھا۔

"تم سے ایک بات کہنی تھی۔ناراض مت ہونا" اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔"میں نے تمہاری امی اور بھائی کو یہاں بلایا ہے۔مجھے بھی میڈم کہا ہے۔ایک بار میرے کہنے پر ان سے مل لو۔ایسے کب تک اکیلے زندگی جیو گی۔ستارہ میں نے بھی اپنی زندگی میں بہت غلطیاں کی ہیں۔شکر ہے مجھے موقع مل گیا انہیں سدھارنے کا۔کسی نے مجھے نصیحت کی تھی۔آج تمہیں کر رہی ہوں واپس لوٹ جاؤ۔"

ستارہ خاموش ہو گئی۔چند پل میں آنٹی خدیجہ، اسد بھائی اور حسن وہاں پہنچ گئے۔اپنی بیٹی اور بہن کو زندہ دیکھ کر وہ سب خوش تھے۔آنٹی خدیجہ وہیل چیئر پر تھیں۔

"آج مجھے بھی گھر جلدی جانا ہے۔مجھے بہت ضروری کام ہے۔ستارہ، اپنے خونی رشتوں کو کبھی نہیں چھوڑتے۔" میڈم وہاں سے اپنے گھر کے لیے نکل پڑیں۔

اسد بھائی ستارہ کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ستارہ نے بھی ان سے بہت باتیں کرنی تھیں۔اصل حقیقت یہ تھی۔ستارہ اپنے بابا کی موت کی ذمہ دار خود کو سمجھتی تھی۔اس لیے وہ اسد بھائی، حسن اور اپنی امی سے دوبارہ ملنا نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

گرم شال اوڑھے اپنی سیل میں لیٹا تسبیح پڑھ رہا تھا۔اب وہ سارا دن تسبیح پڑھتا رہتا۔دل میں خوف تھا۔اگر ڈھول والا اس کو جیل سے نہ نکال پایا تو اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں وہ بے قصور ہے۔شاید باقی زندگی بھی ادھر کاٹنی پڑے۔

سیل کا دروازہ کھلا اور وارڈن اندر آیا۔

"کیسے ہو تیمور؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ شال کے اندر سے بولا۔"ایک بات پوچھنی تھی کافی دنوں سے پوچھنا

چاہتا تھا۔آپ ان ڈھول والے سے کیسے ملے؟''

''جیسے تم ملے۔اللہ کے بندوں سے بس انسان مل جاتا ہے۔تمہیں بتانا تھا تم سے ملنے کوئی آیا ہے۔''

تیمور نے فٹ سے شال پیچھے کی،اچھل کر کھڑا ہوا۔

''ڈھول والا ہوگا۔''

وہ ملاقاتی کمرے کی طرف بھاگا۔وارڈن بھی اس کے پیچھے آیا۔دروازہ کھول کر اسے کمرے میں بھیجا۔تیمور کمرے میں داخل ہوا۔سامنے جو کرسی پر شخص موجود تھا۔اسے دیکھ کر تیمور کے قدم ادھر جم گئے۔کمرے میں کافی دیر خاموشی رہی۔آخرانہوں نے بات شروع کی۔

''کیسے ہو تیمور'' آواز بہت دھیمی تھی۔

''میں نے پاپا کو نہیں مارا'' نظریں زمین پر تھیں۔وہ جانے کے لیے واپس مڑا۔اتنے سالوں بعد اس شخص کو یوں اچانک سامنے دیکھ کر اسے شاک لگا۔

''ہم بات کرسکتے ہیں۔''شاہدہ بیگ کھڑی ہوئی۔جتنا تیمور انہیں دیکھ کر شاک ہوا تھا۔اس سے زیادہ وہ تیمور کو دیکھ کر شاک ہوئی تھیں۔جیل میں رہ کر اس کیا حالت ہوگئی تھی۔پرانی گندی سی شلوار قمیض،پیروں میں جوتی نہیں تھی۔جسم بہت کمزور تھا،سر گنجا تھا۔پیر اور ہاتھ سوجے ہوئے تھے۔چہرے پر چوٹوں یا شاید تشدد کے نشان واضح تھے۔اس کی ہاتھ کی انگلیاں مسلسل ہل رہی تھیں۔

تیمور نہ چاہتے رک گیا۔وہ واپس مڑا،نظریں اب بھی زمین پر تھیں۔جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔

''بیٹھ جاؤ تیمور''شاہدہ بیگ نے برقعہ زیب تن کیا تھا۔سر ٹوپی سے کور تھا۔ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔آنکھوں کے اردگرد حلقے پڑے تھے۔وہ بھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ان کے درمیان

لکڑی کی میز تھی۔

تیمور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں پھر خاموشی تھی۔

”میں یہ تو نہیں پوچھوں گی کیسے ہو۔ پر۔“ وہ کہتے کہتے رکیں۔ ”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ایسا کچھ ہوگا۔ تم دو سال کے تھے جب میری تمہارے بابا سے شادی ہوئی تھی۔ یقین کرو میرا، مجھے اپنے دونوں بچوں سے تم زیادہ عزیز تھے۔ سب بہت اچھا چل رہا تھا۔ نہ جانے کب تم میرے لیے سوتیلی اولاد بن گئے۔“

”جب آپ کے بھائی ثاقب بیگ بیچ میں آئے۔“ تیمور کے لہجے میں ثاقب بیگ کے لیے نفرت صاف نظر آرہی تھی۔

شاہدہ بیگ اس کی بات سن کے خاموش ہوئیں۔ ”تمہارے بابا مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے۔ جو عورتیں فضول میں گھومتی پھرتی ہیں۔ وہ اپنا گھر خود تباہ کرتی ہیں۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھے گھر میں قید کرنا چاہتے ہیں۔ خود وہ عیش کرتے ہیں اور۔۔۔“

”وہ جو تھی۔ لیلیٰ اسے ثاقب بیگ لایا تھا۔ بابا اور اس کے درمیان کچھ نہیں تھا۔ جو ثاقب کہتا تھا وہ وہی کرتی تھی۔ وہ یہ ظاہر کرتی تھی۔ اس کا اور شکیل رضا کے درمیان چکر چل رہا ہے۔ پر ایسا کچھ نہیں تھا۔“

تیمور اب بھی سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ ”آپ کے بھائی نے ہی بابا کا قتل۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”مجھے بہت دیر بعد عقل آئی۔ مجھے اس قتل کے فوراً بعد جرمنی بھیج دیا۔ تمہارے دونوں چھوٹے بھائی جرمنی میں ہیں۔ پتا ہے ہمیشہ تمہارا پوچھتے ہیں۔ ان کو کبھی یقین نہیں آیا کہ ہمارا بھائی ایسا کرسکتا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

”آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔ کس لیے آئی ہیں۔“

''کیوں آئی ہوں یہ پتا نہیں۔ البتہ تمہارے دوست کے کہنے پر آئی ہوں۔'' اپنے آنسو صاف کیے۔

''میرا دوست۔'' وہ حیران ہوا۔

''وہ ڈھول والا پتا نہیں اس نے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا۔''

''آج آپ نے نیل پالش نہیں لگائی۔''

تیمور کی بات سن کر شاہدہ بیگ حیران رہ گئیں۔ جب سے شکیل رضا کا انتقال ہوا تھا۔ انہوں نے نیل پالش لگانا چھوڑ دیا تھا۔

''تمہیں اتنے سالوں بعد بھی یہ بات یاد تھی۔ تمہیں تو نفرت تھی میری نیل پالش سے پھر۔''

''بچپن میں آپ مجھے اپنی نیل پالش سے کھیلنے نہیں دیتی تھیں۔ بس اس لیے غصہ آتا تھا۔''

''تیمور! گھر واپس آجاؤ۔ شاید مجھے اللہ معاف کر دے۔ پر تمہارے بابا وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر وہ تمہیں اس حال میں دیکھ لیتے۔'' وہ رو پڑیں۔

تیمور وہاں سے خاموشی سے واپس چلا گیا۔ شاہدہ بیگ کے رونے کی آواز باہر تک سنائی دی۔ وہ واپس اپنے سیل میں آگیا۔

وہ حیران تھا اپنی سوتیلی ماں کو یہاں دیکھ کر۔ وہ کتنا بدل گئی تھی اسے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کے لیے رو رہی تھی۔ پتا نہیں ڈھول والے نے یہ سب کیسے کر دیا۔ اتنے سال تکلیف برداشت کی ہے۔ اب سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

شاہدہ بیگ جیل سے نکلنے کے بعد سیدھا بنک پہنچی۔ بنک کے منیجر سے ملی۔ منیجر ان کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ شاہدہ بیگ کا آج بھی اتنا رعب تھا۔

''ایسا ہے تم اس نوکری پر کیسے لگے ہو۔ مجھے سب پتا ہے۔ تمہیں اگر کورٹ والے بلائیں تو چپ چاپ پہنچ جانا۔ ورنہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ برا تم کو بھگتنا پڑے گا۔ اور آج جہاں میرا بیٹا ہے وہاں تم ہو گے۔''

''پر میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وسیم کے چہرے کے رنگ بدلے۔

''یہ اب تم طے نہیں کرو گے۔ میں طے کروں گی اس لیے چپ چاپ سچ بولو۔ اس رات کیا ہوا تھا۔ تمہاری ڈگری جعلی ہے نا۔'' کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ سے وسیم کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وسیم بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ابھی صرف سچ بولنا گولی کس نے چلائی تھی۔''

''اتنے سالوں بعد بیٹے کا پیار کیسے جاگ گیا۔'' اپنے کندھے اچکائے۔

''تم اصل بات پر آؤ سچ بولو۔''

''اچھا۔ آج آپ بھی سچ سن لو۔ کافی سالوں سے میرے اندر تھا۔ گولی ثاقب بیگ نے چلائی تھی۔ میں بھی اس وقت ادھر ہی تھا۔ جس روم سے تیمور رضا۔'' طنزاً بولا۔ ''باہر آیا تھا اس کے ساتھ کچن تھا۔ ادھر سے ہی ثاقب نے گولی چلائی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا، گھر کا بیدی لنکا ڈھائے بس وہی ہوا۔'' کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑا۔ ''لیلیٰ نے ہماری مدد کی تھی۔ کچن کا دوسرا دروازہ لان میں کھلتا تھا۔ لیلیٰ نے دروازے کھولے اور بند کیے تھے۔ تیمور کے کمرے سے گن میں نے ہی ثاقب کو لا کر دی تھی۔ سب کچھ پہلے سے پلان تھا۔ آپ کو پارٹی پر بھیجنا، ڈی ایس پی کو رشوت دینا، میڈیا میں خبر آگ کی طرح پھیلانا، وکیل کو ساتھ ملانا۔''

''تم بھی اس میں شامل تھے۔'' شاہدہ بیگ کا حلق خشک ہو گیا۔

''جی۔ جو کرنا ہے آپ کر لیں۔ یہ جعلی ڈگری کی دھمکی مجھے مت دینا۔ میں بہت مصروف

ہوں پلیز۔" اپنے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔

شاہدہ بیگ اپنے آنسو سنبھالتی بنک سے نکل آئیں۔ ثاقب بیگ نے شاہدہ کو جرمنی بھیج کر ساری پراپرٹی دو نمبر طریقے سے اپنے نام کر لی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اپنا کالج کھول لیا۔ ابھی اس ہی کالج کا پرنسپل ہے۔ وسیم کو اندازہ ہی نہیں تھا شاہدہ بیگ نے اس کی باتوں کی ویڈیو بنائی ہے۔

اس نے وہ ویڈیو عدالت اور میڈیا والوں کو دی۔ یہ خبر دوبارہ آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس بار ثاقب بیگ کے خلاف خبریں پھیلنے لگ گئیں۔ اس کے خلاف پہلے ہی کچھ کیس تھے۔ شاہدہ بیگ کی درخواست پر دوبارہ تفتیش کی گئی۔ ثاقب بیگ اور وسیم کو گرفتار کر لیا گیا۔ وسیم وعدہ معاف گواہ بن گیا۔

آخر کار پورے چھ سال بعد تیمور کو رہا کر دیا گیا۔ جیل کا وارڈن اسے اس کی رہائی سے متعلق ایک ایک خبر سے آگاہ کر رہا تھا۔

تیمور اس صبح فجر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ وارڈن نے اسے بتایا کل وہ رہا ہو جائے گا۔ وہ سارا دن تیمور نے جائے نماز پر گزارا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس قید سے رہا ہو رہا ہے۔ شاہدہ بیگ نے اس کے لیے نیا سوٹ اور جوتے بھیجے۔

اگلے دن کچھ قانونی کارروائی کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ دن کا وقت تھا۔ سفید رنگ کی شلوار قمیض پہنے، پیروں میں نئی چپل پہنے، کندھوں پر کالی شال اوڑھے وہ جیل سے باہر آیا۔

جیل سے نکلتے ہی وہ سب سے پہلے اس ہی دربار شریف پہنچا۔ آج بھی اس دربار پر اتنا ہی رش تھا۔ پہلے ہمیشہ رات کو آتا تھا آج پہلی بار دن کے وقت آیا تھا۔ وہ اس ہی چائے کی دکان پر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈھول والا وہاں موجود نہیں تھا۔

”سر! کیا لیں گے۔“

”چائے۔“ نظریں دربار پر تھیں۔

”آپ تو کافی سالوں بعد آئے ہیں۔“

اس کی بات پر تیمور نے نظروں کا رخ اس طرف کیا۔ایک لڑکا اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”تم کون ہو؟ کیا میں تم کو جانتا ہوں۔“ لہجہ سپاٹ تھا۔

”آپ یاد کریں آپ پہلے بھی اس ہی دکان سے چائے پیتے تھے۔آپ کی پہلی چائے گر جاتی تھی۔پھر آپ کے لیے دوسری چائے ڈھول والے بھائی منگواتے تھے۔“ اس کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔

”وہ ڈھول والا۔“ اپنی انگلی سے دربار کی طرف اشارہ کیا۔”کہاں ہے؟“

”وہ کہتے ہیں جب وہ بلاتے ہیں وہ حاضر ہو جاتے ہیں۔“

تیمور نے اس اسے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔اسے پتا ہی نہیں چلا وہ اس ہی چائے کی دکان پر واپس آیا تھا۔

”تم کافی بڑے ہو گئے ہو۔“

”سر جی، چھوٹا کون ہوتا ہے۔سارے بڑے ہوتے ہیں۔“ اپنی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”اکبر ادھر آ۔اسے چائے دے۔تو پھر باتیں کرنے لگ گیا ہے۔“

”آیا ابھی آیا۔“ وہ جانے لگا۔

”تمہارا نام اکبر ہے؟“ تیمور فٹ بولا۔

”جی۔کیوں آپ کا نام بھی اکبر ہے۔“ اپنی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلی رکھی۔”لگتا نہیں کیونکہ آپ میری طرح خوبصورت نہیں ہیں۔“ دوبارہ ہنسا۔

”ایک کپ چائے۔“

وہ لڑکا اپنی دکان میں چلا گیا۔تیمور نے سامنے دیکھا۔وہ زور سے چیخا۔اردگرد لوگوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔سامنے وہی ڈھول والا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

”پتر! کیا حال ہے؟“

تیمور اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگ کر ان سے گلے ملا۔وہ بھی اس سے بہت گرم جوشی سے ملے۔

”آپ نے یہ سب کیسے کیا؟“

”پتر! ایسا نہیں کہتے۔سب اللہ کی ذات کرنے والی ہے۔سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرو۔“

تیمور ان کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔اکبر انہیں چائے دے گیا۔

”اب آگے کیا کرنا ہے؟ کہاں رہو گے۔اپنی تعلیم شروع کرو گے؟“ڈھول والے نے گرم چائے کا سپ لیا۔

”میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔“آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔اپنے اردگرد نظر دوڑائی، گہری سانس لی۔

”سب سے پہلے اپنے گھر جاؤ تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”گھر۔اتنے سالوں بعد انہوں نے مجھے آزاد کروایا ہے تو کیا میں انہیں معاف کر دوں۔ انہوں نے کیسے مان لیا کہ میں نے اپنے بابا کا قتل کیا ہے۔“وہ اب بھی تکلیف میں تھا۔

”انہوں نے بھی بہت تکلیف کاٹی ہے۔تم ان کے بیٹے ہو۔ماؤں کے بارے میں ایسے نہیں کہتے۔بیشک وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔کیا میری بات نہیں مانو گے۔دیکھنا اللہ تم پر کیسے اپنا کرم کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ پر مجھے آگے نہیں پڑھنا۔ مجھے کوئی نوکری بھی نہیں دے گا۔“

”اللہ اس میں بھی اپنا کرم کرے گا۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔ ویسے تیمور، ایک بات ہے۔ اتنے سالوں بعد تم میں ایک تبدیلی ضرور آئی ہے۔“ چائے کا کپ میز پر رکھا۔

”وہ کیا؟“ اپنے کندھے اچکائے۔

”اب تمہاری مونچھیں نکل آئی ہیں۔“

تیمور اس بات پر قہقہہ لگا کر اتنی زور سے ہنسا، اردگرد بیٹھے لوگوں نے پھر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کافی سالوں بعد آج جا کر ہنسا تھا۔ آزادی پر خوش ہونا واقعی بنتا تھا۔

”آپ کو میری مونچھیں نظر آ ئیں۔“ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”اس کا مطلب ہے اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اپنی نئی زندگی کی شروعات اچھے اور نیک کام سے کرنا۔ اور نیکی کرنی ہے تو سب سے پہلے اپنی ماں کی خدمت کرو۔“ ڈھول والا اس کے لیے واقعی فکر مند تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا اس کے اندر آتش فشاں پک رہا ہے۔ وہ بے قصور تھا۔ اسے اتنے سال اپنے باپ کے قتل کے جرم میں اسے سزا کاٹنی پڑی۔ ”پتر! میری ایک بات مانو گے۔“

دوپہر کا وقت تھا۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق تھی۔ دربار پر منت مانگنے والوں کا رش ہمیشہ کی طرح تھا۔ گلاب اور موتی کے پھولوں سے ساری سڑک مہک رہی تھی۔ تیمور تھا تو باتوں میں مصروف پر اس کی آنکھیں مسلسل اپنے گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ظاہری بات ہے قید کے بعد دنیا کو یوں آزادی سے دیکھنا اچھا تو لگتا ہے۔ وہ دربار کو بھی دیکھتا پھر جیسے نظریں چرا لیتا۔

"آپ کی ہر بات مانوں گا۔ آپ کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔"

"پہلی بات تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔ تم نے آگے نہیں پڑھنا ٹھیک ہے پر کیا تم قرآن مجید کا ترجمہ سیکھو گے۔"

"قرآن پاک کا ترجمہ؟" حیرت ہوئی۔

"کیوں نہیں سیکھنا کیا۔ کیا اپنی آخرت نہیں سنوارنی۔ اپنے بابا کے لیے دعا کی مغفرت نہیں کرنی۔ تم نے بتایا تھا وہ یونیورسٹی کے پیپرز لیک کرتے تھے۔ تو کیا تم ایسا کچھ اچھا نہیں کرنا چاہو گے۔ جس سے انہیں قبر میں سکون ملے۔" ڈھول والے کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"کیوں نہیں میں قرآن پاک کا ترجمہ ضرور سیکھوں گا۔ اپنے بابا کے لیے میں سب کچھ کروں گا۔ جب وہ زندہ تھے میں نے ان کو کبھی کوئی خوشی نہیں دی۔ پر اب۔" نظریں پھر دربار پر گئیں۔ "میں اپنے گھر ضرور جاؤں گا۔ اپنے بابا کے لیے سب کچھ کروں گا۔" اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

ایک شخص ادھر لنگر بانٹ رہا تھا۔ وہ ڈھول والے کے پاس بھی آیا۔ ڈھول والے نے اس سے لنگر لے لیا۔ جب اس نے وہ لنگر تیمور کے آگے کیا۔ اس بار اس نے خود اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کھول دیے۔ وہ اس کی ہاتھ کی ہتھیلی پر برفی کا ٹکڑا رکھ گیا۔ وہ برفی کا ٹکڑا اس نے فوراً منہ میں ڈال لیا۔

"چلو پہلے دربار شریف پر حاضری دے آتے ہیں۔ پھر تم سیدھا اپنے گھر جانا۔ مجھ سے کل ملنا میں تم کو مولوی صاحب سے ملوا دوں گا۔ تم ان سے قرآن پاک کو پڑھنا اور سیکھنا۔" اکبر کو اشارہ کیا۔

اسے چائے کے پیسے دیئے۔ تیمور سچ میں شرمندہ تھا۔ اس میں کتنا غرور تھا اور آج وہ کس

حال میں ہے۔ وہ ڈھول والے کے ساتھ دربار شریف پہلی بار گیا۔ وہاں پر حاضری دی، دعا مانگی۔ ڈھول والا بعد میں اسے اس کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ محلّہ کافی پرانا تھا۔ یہ نیا گھر تھا۔ کچھ دیر باہر کھڑا رہا پھر گیٹ پر دستک دی۔ شاہدہ بیگ نے فوراً دروازہ کھولا۔

''کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کہاں چلے گئے تھے؟''

''ایک ضروری کام سے گیا تھا۔''

''اندر آجاؤ۔'' ان کے لہجے میں پیار صاف نظر آرہا تھا۔ ''مجھے بہت خوشی ہے تم آئے ہو۔''

تیمور اندر داخل ہوا۔ گھر چھوٹا تھا پر صاف ستھرا تھا۔ اسے کمرے میں لاکر بٹھایا۔ اس کا کمرہ اوپر والی منزل پر تھا۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔''

وہ کچن میں چلی گئیں۔ تیمور کی دیوار پر نظر پڑی۔ پوری دیوار تصویروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی تصویریں بھی موجود تھیں۔

''آپ نے وہ گھر چھوڑ دیا۔''

''ہاں۔ سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا۔ جو رقم بچی تھی اس سے یہ گھر خریدا ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ میں تمہاری امانت پڑی ہے۔ تم جب چاہے لے لینا۔''

''دونوں چھوٹے کہاں ہیں؟''

''ادھر جرمنی میں۔'' ٹیبل پر کپڑا پھیرا۔

''آپ ادھر اکیلی ہوتی ہیں۔'' کرسی پر بیٹھ گیا۔ شال کندھوں سے اتار دی۔

''ہاں ویسے تو اکیلی ہوتی ہوں۔ پر آج کل کافی مصروف ہوتی ہوں۔ کھانا گرم ہو گیا ہو گا۔ تم فریش ہو جاؤ۔ ابھی لاتی ہوں۔ تمہاری الماری میں تمہارے کپڑے پڑے ہیں۔

تمہارے چھوٹے بھائیوں کا پتا چلے گا تم آئے ہو۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔'' شاہدہ بیگ اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھیں۔

وہ دوبارہ کچن میں چلی گئیں۔ تیمور نے الماری کھولی۔ اس میں نئے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک ٹراؤزر اور شرٹ نکالی، تولیہ لیا اور واش روم چلا گیا۔ جب فریش ہو کر آیا میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ پالک کی سبزی، کالے چنے اور چاول میز پر تیار پڑے تھے۔

''تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے۔'' پانی کا جگ رکھا۔

''یہ سب آپ نے بنایا ہے۔'' تولیہ کرسی پر ڈالا۔

''میں نے بنایا ہے تمہارا فیورٹ۔ کھا کر بتاؤ کیسا بنا ہے؟''

تیمور کو بہت حیرت ہوئی۔ کیا شاہدہ بیگ کو کھانا بنانا آتا ہے۔ اور دوسرا انہیں اس کی فیورٹ ڈش کا کیسے پتا۔ پلیٹ میں چاول اور سالن ڈالا۔ اتنے سالوں بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا۔ پہلا لقمہ لیا۔ کھانا واقعی بہت مزے کا تھا۔ شاہدہ بیگ بھی پاس بیٹھ گئیں۔

''اچھا بنا ہے۔''

''تمہارے بابا بھی ہمیشہ ایسے کہتے تھے۔ صرف اچھا بنا ہے۔''

''مجھے نوکری کرنی ہے۔ کام کرنا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔''

''تم پہلے اپنی پڑھائی۔''

''مجھے نہیں پڑھنا۔ کام کرنا ہے۔'' ان کی بات کاٹ دی۔

''ٹھیک ہے میرے ساتھ کام کر لو۔ میں نے اپنا ایک لڑکی کے ساتھ مل کر جام ڈیلیوری کا کام شروع کیا ہے۔ وہ جام مری کے ہوٹل میں ناشتے کے لیے جاتا ہے۔ تم کل میرے ساتھ اس ہوٹل میں چلنا۔ اس نے ابھی اپنا ہوٹل اور ریسٹورنٹ کھولا ہے۔ شاید تمہیں ادھر کوئی کام مل

جائے۔" کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"ابھی چل سکتے ہیں۔" اپنا کھانا ختم کیا۔ پلیٹ اچھے سے صاف کی۔

"ابھی۔" شاہدہ بیگ کو حیرانگی ہوئی۔

"ابھی شام ہو رہی ہے۔ ریسٹورنٹ اس وقت کھلا ہوگا۔ کیا آپ نہیں چاہتی ہیں میں کام کروں۔" اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

"تم کچھ آرام کرلو۔ اور اگر پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر لیتے۔" اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

تیمور دروازے کی طرف چل پڑا۔ شاہدہ بیگ نہ چاہتے ہوئے اس کے ساتھ چل دیں۔

وہ دونوں رکشہ لے کر ہوٹل پہنچے۔ یہ پہلی بار تھا تیمور رکشہ میں بیٹھا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے اسے کام چاہیے۔ کیا آپ کے ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں اسے کچھ کام مل سکتا ہے۔"

"کیا کام کرنا آتا ہے۔" افسر نے سوال کیا۔

"زیادہ نہیں بس چائے بنانا آتی ہے۔ کہتے ہیں تو ابھی بنا کر پلاتا ہوں۔"

تیمور کی بات سن کر شاہدہ بیگ حیران رہ گئیں۔ اسے چائے بنانا آتی ہے۔ اور تیمور ہوٹل میں چائے بنائے گا۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے ہاتھ کی چائے پینا چاہوں گا۔" اپنے مینیجر کو آواز دی۔ "اسے کچن میں لے جاؤ۔ اسے چائے بنانے کا سامان دے دو۔ کوئی اس کی مدد نہیں کرے گا۔"

مینیجر تیمور کو لے کر کچن چلا گیا۔ شاہدہ بیگ کا بی پی ہائی ہونے لگا۔ وہ اللہ سے دعا مانگنے لگیں۔ کچھ دیر بعد تیمور چائے بنا کر آفس میں لایا۔ چائے کا کپ فوجی افسر کے آگے رکھا۔ انہوں نے چائے کا پہلا سپ لیا۔ تیمور پاس ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

”ویل ڈن بوائے۔چائے تو بہت مزے کی ہے۔مجھے تمہاری چائے پسند آئی۔“
تیمور نے شاہدہ بیگ کو دیکھ کر اپنی بھنویں اچکائیں۔
”پھر۔کیا یہ کل سے کام پر آجائے؟“شاہدہ بیگ کو ٹینشن لاحق ہوئی۔
”مجھے پہلے آپ کا کام بہت پسند آیا ہے۔اور اب یہ چائے۔زبردست۔تم کل سے کام پر آجاؤ۔سیلری کل طے کریں گے۔“
”ٹھیک ہے پر مجھے شام کی ٹائمنگ سوٹ کرے گی۔میں نے صبح کلاسز لینے جانا ہے۔“
”کس چیز کی کلاسز۔“افسر کو تعجب ہوا۔
”میں نے قرآن پاک کا ترجمہ سیکھنا ہے۔سر صبح قرآن کا ترجمہ سکھاتے ہیں۔“تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
”ٹھیک ہے مجھے خوشی ہوئی تم اس عمر میں یہ سب سیکھ رہے ہو۔ویسے بھی کسٹمرز کا رش شام کو زیادہ ہوتا ہے۔میں ٹائم کے حوالے سے بہت سخت ہوں۔اس لیے وقت پر آیا کرنا۔اور جھوٹ بھی برداشت نہیں کرتا۔“
”آپ کو انشاءاللہ شکایت نہیں ہوگی۔“تیمور نے اپنے سر کو خم دیا۔
شاہدہ بیگ بھی تیمور کے لیے بہت خوش تھیں۔انہیں یقین نہیں آرہا تھا یہ وہی تیمور ہے۔انہیں فکر تھی جیل سے نکلنے کے بعد اس کا رویہ کیسا ہوگا۔پر وہ تو اور بدل گیا تھا۔
”تم نے چائے بنانا کہاں سے سیکھی۔“شاہدہ بیگ نے گھر پہنچتے ہی پہلا سوال یہی پوچھا۔
”اکبر سے۔آج ہی سیکھی ہے۔“تیمور نے سٹور روم دیکھا۔جہاں صرف جام بنتا تھا۔
شاہد بیگ بہت حیران ہوئیں۔زیادہ سوال نہیں پوچھے۔”تمہیں کچھ دینا تھا۔“وہ اس

کے ساتھ اس کے کمرے میں آئیں۔ تیمور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ الماری کے نچلے حصے سے تیمور کو اس کا بیگ نکال کر دیا۔ یہ وہی بیگ تھا جو اس رات اپنے ساتھ امریکہ لے جا رہا تھا۔

اپنا بیگ دیکھ کر حیران ہوا۔ اس رات کی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔

"اس میں تمہارا لیپ ٹاپ، موبائل، گیجٹس ہیں۔ اور یہ تمہاری امی کی سونے کی چین۔ تم اب آرام کرو۔ صبح ملتے ہیں۔"

وہ اسے اس کا سامان دے کر نیچے اپنے کمرے میں آ گئیں۔ کتنی دیر بیگ کو تکتا رہ گیا۔ اس کی ماں کی سونے کی چین۔ اس کی ماں کی نشانی شاہدہ بیگ نے سنبھال کر رکھی تھی۔

اپنی ماں کی چین دوبارہ اپنے گلے میں پہن لی۔ بیگ کو دوبارہ الماری میں رکھ دیا۔ اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ آج اپنے گھر میں تھا، نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اگر ڈھول والا اس کی مدد نہ کرتا تو شاید آج بھی جیل میں ہوتا۔ اس کی سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ ڈھول والے نے کس طرح شاہدہ بیگ کو قائل کیا تھا وہ بے قصور ہے۔ پر اب جو بھی ہو وہ اس ڈھول والے کی ہر بات مانے گا۔ بس وہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ نہیں رہے گا۔ اگر مدرسے میں ہاسٹل ہوا تو ادھر ہی شفٹ ہو جائے گا۔

☆......☆......☆

"تم نے ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ ایک فون تو کر سکتی تھی۔"

"مجھے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا۔ ساری زندگی مجھے یہی سننے کو ملتا۔ میری وجہ سے پاپا اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔"

اسد بھائی نے پاکستان میں اپنا نیا گھر خریدا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان میں شفٹ ہو گئے تھے۔ ادھر ہی ہسپتال میں جاب کر رہے تھے۔ حسن بھی ساتھ میں رہتا تھا۔

سلیم اور سندس سے انہوں نے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا۔

سب اسد بھائی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ آنٹی خدیجہ بھی وہاں موجود تھیں۔ ان کی نظر پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔

''ستارہ! تمہاری وجہ سے پاپا اس دنیا سے نہیں گئے۔ مجھے اس وقت خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس سب کے پیچھے بھی سلیم اور سندس کا ہاتھ تھا۔ جب پاپا کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا میں ان کے ساتھ تھا۔ ان کو کمزوری کی وجہ سے سڑک پر چکر آ گئے تھے۔'' حسن پہلی بار اسے سچ بتا رہا تھا۔ اسد بھائی اسے گھورے جا رہا تھا۔ اگر وہ اس وقت ستارہ کا ساتھ دیتا یا کم از کم اسے سچ بتاتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ ''ستارہ۔ پاپا کے ایکسیڈنٹ کے بعد سلیم نے ماما پر تمہاری شادی کا بہت پریشر ڈالا تب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کیا کریں۔ وہ تو پہلے ہی پاپا کی وجہ سے پریشان تھیں۔''

''تم اس وقت منہ بند نہ رکھتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔'' اسد غصے سے دھاڑا۔ ''مجھے اب تک حیرت ہوتی ہے۔ پاپا اس قدر بیمار پڑ گئے تھے۔ اور مجھے کسی نے بتانا ضروری ہی نہیں سمجھا۔ اس سلیم اور اس کی بیگم کو اللہ پوچھے گا۔ پاپا کا ٹھیک طریقے سے علاج کروایا ہوتا تو آج وہ صحیح سلامت ہوتے۔ میں کہتا رہ گیا مجھے ان کی ایک بھی میڈیکل رپورٹ نہیں بھیجی۔''

''اس وقت پورے گھر پر سلیم کا حکم چل رہا تھا۔'' حسن دبی آواز میں بولا۔

''اور خود تم اپنی زندگی بنانے کے لیے ملک سے چلے گئے۔ ایک بار بھی اپنی چھوٹی بہن کا نہیں سوچا۔''

''ستارہ!'' آنٹی خدیجہ پہلی بار بولیں۔ ''جس رات انہوں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ وہ ساری رات سو نہیں پائے۔ تم ہمیشہ سے ان کی لاڈلی تھی۔ اس صبح جاتے ہوئے مجھ سے کہہ

گئے تھے۔اگر ستارہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہے تو اس میں کوئی بری بات نہیں۔ہم ستارہ کا خود رشتہ لے کر جائیں گے۔بس میں ہی سلیم کی باتوں میں آ گئی تھی۔اس صبح ہی سلیم نے تمہارے پاپا کے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی۔جس کی وجہ سے ان کو دکان پر چکر آ گئے۔''

''میں دن رات اپنے آپ کو کوستی رہی۔میری ہی غلطی کی وجہ سے پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔اور اب آپ مجھے یہ سب بتا رہی ہیں۔میری زندگی تباہ ہو گئی۔میرا خواب ٹوٹ گیا۔آپ نے ڈاکٹر بننا تھا بن گئے۔اسے جائیداد چاہیے تھی مل گئی۔تم نے کرکٹر بننا تھا بن گئے اور میں۔'' اپنے آنسو صاف کیے'' آپ لوگ اب بھی یہی سمجھیں میں مر گئی ہوں۔مجھ سے دوبارہ کبھی مت ملنا۔''

وہ اٹھ کر جانے لگی تو اسد بھائی نے اسے روک لیا۔حسن نے بھی اس سے معافی مانگی۔ آنٹی خدیجہ پہلے بہت بیمار تھیں۔اسد کی بیگم حناء نے ستارہ کو جانے سے روکا۔اسے سمجھایا۔

''کوئی ایسا وقت نہیں تھا جب سب نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔آنٹی ہمیشہ تمہارے لیے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔''

ستارہ اس رات واپس یونیورسٹی آ گئی۔وہ ساری رات تکلیف میں رہی۔اگلے دن سب کچھ پروفیسر حلیمہ کو بتایا۔ایک وہی تھیں جو اس کو اچھی نصیحت کرتی تھیں۔اس کے ساتھ کیا ہوا وہ سب جانتی تھیں۔

''تم واپس لوٹ جاؤ۔اجر دینے والی ذات اللہ کی ہے۔تمہارے سارے بھائیوں کا خواب پورا ہوا۔اللہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔وہ اپنے بندے پر اتنی مصیبت ڈالتا ہے۔جتنی وہ برداشت کر سکتا ہے۔ہو سکتا ہے اللہ نے تمہارے لیے کچھ اور بہتر سوچا ہو۔اور جو تمہیں چاہیے تھا وہ تم سے دور کر لیا ہو۔یقین کرو اس میں ضرور اس کی کوئی حکمت ہو گی۔''

"میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔
"آپ سوچیں میں نے یونیورسٹی کا ڈین بننا تھا اور آج میں ایک یونیورسٹی میں جھاڑو لگاتی ہوں۔"
"اللہ تمہیں اس کا انعام ضرور دے گا۔ وہ کبھی اپنے بندوں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔" لہجہ ہمیشہ کی طرح نرم تھا۔
"میں نے ہمیشہ سوچا تھا، میں دنیا کی بیسٹ ٹیچر بنوں گی۔ میں بچوں کی تعلیم سے زیادہ ان کی تربیت پر زور دوں گی۔ ان کو صحیح اور غلط میں فرق بتاؤں گی تا کہ کمینے اور گھٹیا جیسے استادوں اور لوگوں سے بچ کر رہیں۔"
"تم ہمت کرو، کوشش کرو۔ اپنا خواب اب پورا کرو۔ اللہ نیک سوچ والوں کا ساتھ ضرور دیتا ہے۔ پتا ہے جب بندہ کوئی نیکی کرنے کے بارے میں صرف سوچتا ہی ہے۔ اللہ اس کی نیکی لکھ لیتا ہے۔ تم پھر سے اپنی پڑھائی شروع کرو۔ پر پہلے اپنوں کے پاس واپس لوٹ جاؤ۔" ان کی کلاس لینے کا ٹائم ہو رہا تھا۔
"ٹھیک ہے میں آپ کی بات نہیں ٹال سکتی۔ اپنے بھائیوں کے پاس واپس لوٹ جاتی ہوں۔ یہ کام تو چھوڑ دوں گی۔ پر جام بنانے کا کام نہیں چھوڑ سکتی۔"
"جیسے تمہاری مرضی۔ مجھے تمہارے لیے بہت خوشی ہو گی۔ ایک بات مجھے یاد آئی۔ اس دن تمہیں شاپنگ مال میں کون نظر آیا تھا؟"
"سلیم اور سندس۔"
ستارہ ان سے مل کر واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ نوکری چھوڑ جانے کی درخواست لکھی۔ اپنا سامان پیک کیا۔ حسن کو فون کیا، شاہدہ بیگ نے ہی اسے موبائل لے کر دیا تھا۔ وہ اسے

لینے آ گیا۔ اپنا کمرہ چھوڑ دیا جہاں وہ کافی سال رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی۔

آنٹی خدیجہ اور اسد بھائی اس کے واپس آنے پر بہت خوش تھے۔ یہ گھر کافی بڑا تھا۔ ستارہ کو علیحدہ کمرہ دیا۔ اسد نے لندن میں شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک بچہ بھی تھا۔

☆......☆......☆

''پہلے ہی دن لیٹ۔ تمہاری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔''

''ابھی آدھا گھنٹہ رہتا ہے۔'' تیمور، شاہدہ بیگ کے کمرے میں کھڑا اسلامی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔

''قرآن پڑھنے اور سیکھنے جا رہے ہو۔ اس لیے وقت سے پہلے پہنچنا۔ جو تعلیم لینے جا رہے ہو اس کی عزت کرنا۔'' ناشتہ میز پر لگایا۔

''آپ جرمنی سے کیوں لوٹ آئیں۔ اور اتنا کیسے بدل گئیں۔'' وہ کرسی پر ناشتے کے لیے بیٹھا۔

''بس شاید کوئی نیکی کی تھی۔ جس طرح تمہیں ڈھول والا مل گیا۔ مجھے بھی اسلامک سنٹر اور یہ کتابیں مل گئیں۔'' کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''اب بہت سے لیکچر نیٹ سے لیتی ہوں۔ یہ بتاؤ اس ڈھول والے کا کیا نام ہے۔'' کچن سے پوچھا۔

''کبھی خیال ہی نہیں آیا پوچھنے کا۔''

''اب ملاقات ہو تو ضرور پوچھنا۔'' چائے کا کپ اس کے آگے رکھا۔

تیمور اپنا ناشتہ مکمل کر کے مدرسے کے لیے نکل گیا۔ مدرسے کا ہال بہت بڑا تھا۔ سارے بچے چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خاکی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد پورے ہال میں اچانک خاموشی چھا گئی۔

پینٹ کوٹ پہنے، سفید داڑھی والے ایک شخص سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ انہوں نے سلام کیا اور اپنا آج کا لیکچر سٹارٹ کیا۔ مولانا احمد علی کے لہجے میں اتنی مٹھاس تھی کہ ان کی باتیں دل کو چھوتی تھیں۔ اپنے سارے لیکچر سادہ الفاظ میں سمجھاتے تھے۔

"ہمارا آج کا ٹاپک ہے ماں کی خدمت۔"

ان کا آج کا ٹاپک سن کر تیمور نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔ عین اس لمحہ انہوں نے بھی تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ فٹ سے نظریں چرا گیا۔ ان کی ایک نظر سے ایسے لگا جیسے وہ اس کا سارا ماضی، حال اور مستقبل جان گئے ہیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا، ماں کی خدمت، یہ ٹاپک آج کے دن ہی۔

"اللہ سب کی ماؤں کو ان کے سر پر سلامت رکھے۔ اللہ نے انسان کے لیے جنت میں جانے کا سب سے آسان ذریعہ ماں کی خدمت میں رکھا ہے۔ ماں کی شان کا اندازہ اس بات سے آپ خود لگا لیں۔ اللہ نے جنت ماؤں کے قدموں تلے رکھی ہے۔ گستاخ اولاد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جو شخص اپنے والدین کی عزت نہیں کرتا، ان کی نافرمانی کرتا ہے۔ اس کی تکلیف دنیا سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔"

یہ بیان سن کر تیمور کے کان کھڑے ہو گئے۔ "نافرمانی۔" اپنے پاپا کے ساتھ گزرا وقت یاد آیا۔ بیشک ماں سوتیلی تھی۔ ان سے کی بدتمیزی بھی یاد آئی۔ اپنا سر نیچے کر لیا۔ چٹائی پر انگلی پھیرنے لگا۔

"میرے بچو! آپ سب اپنی زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اپنے ماں باپ کی عزت کرو۔ تم سب کی ساری تکلیفیں آسان ہو جائیں گی۔ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اگر وہ سختی بھی کر

لے تب بھی آگے سے اُف مت کہنا۔ان کا ساتھ کبھی مت چھوڑنا۔"

اس نے پھر ایک نظر مولانا احمد علی کی طرف دیکھا۔پھر اس کی نظر ان سے ٹکرائی۔اس بار اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

"ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ایک بار حضرت محمد صلی وعلیہ وآلہ وسلم نے ممبر پر قدم رکھتے ہوئے آمین، آمین، آمین کہا۔صحابہ کرام نے آمین فرمانے کی وجہ سے دریافت کی تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ابھی جبرائیل میرے پاس آئے تھے۔اور کہا تھا اس شخص پر لعنت ہو۔جو ماہ رمضان کو پائے اور کثرت عبادت سے اپنی بخشش نہ کروا پائے تو میں نے آمین کہا۔

جبرائیل نے پھر فرمایا، اس شخص پر لعنت ہو جو والدین کو بڑھاپے میں پائے اور جنتی نہ ہو سکے تو میں نے آمین کہا۔

جبرائیل نے پھر کہا، اس شخص پر لعنت ہو جس کے سامنے آپ سرکار کا ذکر ہو اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے تو میں نے آمین کہا۔"

"آپ سب جوان ہو، اپنے والدین کو کبھی ناراض مت کرنا۔ان کا ہر حکم ماننا۔ان سے اونچی آواز میں بات تک نہ کرنا۔اپنے دلوں کو صاف رکھو۔غصہ نہ کرو یہ تمہیں تباہ کر دے گا۔کسی نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے تو اس کو اللہ پر چھوڑ دو۔تم کبھی غلط راہ نہ اپنانا۔اللہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔"

مولانا احمد علی نے اس دن اتنا ہی لیکچر دیا۔باقی قرآن کے ترجمے کی کلاس علیحدہ ہوتی تھی۔آج اس کا پہلا دن تھا۔کلاس ختم ہونے کے بعد وہ مولانا سے ملنے گیا۔

"اگر ماں سوتیلی۔"

"ماں سوتیلی بھی ہو تب بھی۔" ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا احمد علی نے بات مکمل کی۔ "اگر تمہاری ماں سوتیلی ہے تب بھی تم ان کی خدمت کرو۔ ان کو کبھی کوئی دکھ نہ دینا۔ جب وہ تمہارے لیے دعا مانگیں گی تو دیکھنا اللہ کس طرح تمہاری مشکلات آسان کرتا ہے۔"

تیمور کمرے میں زمین پر ان کے آگے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ان کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

"مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ دل کرتا ہے اپنے باپ کے قاتلوں کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں۔ میں ابھی حال ہی میں جیل سے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں جیل میں گزرا وقت مجھے جینے نہیں دے گا۔ وہ تکلیفیں، وہ اذیتیں، وہ چیخیں، وہ مار۔ میں بے قصور تھا" وہ آگے بول نہ پایا۔

"تم سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کرو۔"

مولانا احمد علی کے سامنے بیٹھا لڑکا ان کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"میں اللہ کا شکر ادا کروں۔ پر کس بات کا۔ میں اتنے سال جیل میں گزار کر آیا ہوں۔"

"اللہ بہت غفور و رحیم ہے۔ جب اللہ کسی انسان پر کوئی مشکل ڈالتا ہے تو وہ اسے اپنے اور قریب کر لیتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ جیل جانے سے پہلے تمہاری زندگی کیا تھی۔ اور تم کیسی زندگی جینا چاہتے تھے۔" ان کے لہجے میں بہت محبت تھی۔

"میں عیش کی زندگی جی رہا تھا۔ میرے پاس سب کچھ تھا۔ میں امریکہ جانے والا تھا۔ وہاں جا کر تعلیم حاصل کرتا، جاب کرتا، اپنا بزنس شروع کرتا، دنیا گھومتا، وقت آنے پر شادی کرتا۔ مجھے قرآن پڑھنا نہیں آتا۔ میں نے اب جا کر نماز پڑھنا سیکھی ہے۔"

"اس سارے وقت میں تم نے کبھی اللہ کو یاد کیا؟"

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کبھی ضرورت نہیں پڑی۔''

''اور اب تم کہاں ہو۔ کہاں بیٹھے ہو۔'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''مدرسے میں۔ قرآن کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔''

''بس اس ہی بات کا شکر ادا کرو۔ تمہاری کوئی تکلیف ضائع نہیں جائے گی۔ شاید اللہ تمہیں اپنے قریب کرنا چاہتا ہو۔ اس لیے تمہیں مشکل میں ڈالا۔ بیٹا! یہ مصیبت اور تکلیفیں سب وقتی ہیں۔ اصل زندگی تو وہاں شروع ہو گی۔ یہ دنیا صرف ایک دھوکہ ہے۔ شکر ادا کرو تم اس دھوکہ میں نہیں کھوئے۔ اپنے اندر سے غصہ ختم کر دو۔ اپنے دل میں صرف اللہ کی عبادت کرو۔ وہ تمہیں سکون دے گا۔ تیمور بچے، اللہ کا شکر ادا کرو۔ جب انسان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اور وہ اس کا کفارہ اس دنیا میں کاٹ لیتا ہے۔ کیونکہ آخرت میں بہت سخت پوچھ گچھ ہو گی۔ اللہ کا شکر ادا کرو اس نے تمہیں چن لیا۔ تمہیں اس دنیا کی رنگینیوں میں کھونے نہیں دیا۔ تمہیں چھوٹی مشکل میں ڈال کر بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ تمہیں میری صرف ایک بات ماننی ہے۔ یہی تمہارا اس مدرسے میں پہلا سبق ہے۔ بولو میری بات مانو گے۔''

''جی سر۔''

''تمہیں اپنی ماں کی ہر بات ماننی ہے۔ ان کو ہمیشہ خوش رکھنا ہے۔ یہی تمہارا پہلا سبق ہے۔ کبھی فارغ بیٹھو تو اپنے آپ کو ٹٹولنا۔ تم کیسے انسان ہو۔ اپنے اندر جھانکنا۔ سچ بولنا۔''

''جی سر۔''

''ٹھیک ہے اب اگلا لیکچر کل ہو گا۔ اور جب بھی تم تکلیف میں ہو۔ جو تمہاری جیب میں تسبیح ہے۔ اسے فوراً نکال کر پہلا کلمہ پڑھ لیا کرو۔''

ان کے سمجھانے کا طریقہ بہت سادہ اور اچھا تھا۔ تیمور کچھ دیر اور ادھر بیٹھا رہا۔ ظہر کی نماز

ادا کرنے کے بعد ہوٹل کے لیے نکلا۔سارا راستہ مولانا کی باتوں پر غور کرتا رہا۔

"مجھ میں کتنا غرور تھا۔کوئی بھی مجھ سے خوش نہیں تھا۔اگر میں واقعی امریکہ چلا جاتا تو شاید مجھے صرف اتنا پتا ہوتا۔بس میں صرف ایک مسلمان ہوں۔میں نے کبھی کوئی نیکی یا اچھا کام نہیں کیا۔اگر میں جیل نہ جاتا تو واقعی اللہ سے دور رہ کر گمراہی کی زندگی بسر کر رہا ہوتا۔"

ابھی وہ ہوٹل کے قریب ہی تھا۔پاس سے ایک پولیس وین گزری۔تیمور پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔اسے اپنا وقت یاد آیا۔دل گھبرانے لگا۔مولانا کی بات یاد آئی۔جیب سے تسبیح نکال کر پڑھنے لگا۔

ایک دم سے چونکا۔مولانا صاحب کو کیسے پتا چلا میرے پاس تسبیح ہے۔اور اگر پتا چل بھی گیا تو انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا۔میں اس پر پہلا کلمہ پڑھتا ہوں۔

ہوٹل پہنچ کر دوبارہ وضو کیا۔کچن میں آکر چولہے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔منیجر نے اسے سامان بتایا اور چائے بنانے کو کہا۔آج کام پر پہلا دن تھا۔

اکبر کی سکھائی ہوئی چائے سے اپنے کام اور رزق کا آغاز کیا۔اس کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے گاہکوں نے بہت پسند کی۔وہیں پر شام کی نماز پڑھی اور کھانا کھایا۔رات گیارہ بجے کام سے فارغ ہوا۔فوجی افسر نے اسے اپنے آفس میں بلایا۔

"میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں۔تمہارے ہاتھوں کی چائے سب کو بہت پسند آئی ہے۔تمہاری نوکری پکی۔" اسے کچھ روپے دیئے۔"یہ لو یہ تمہارا خرچہ۔اور اپنی امی سے کہنا پرسوں جام کی سو بوتلیں تیار چاہئیں۔"

تیمور نے وہ پیسے لے لیے۔یہ اس کی زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ہوٹل سے گھر کے لیے نکلا۔راستے پر دکان پر رکا،کچھ سامان لیا اور سیدھا گھر روانہ ہوا۔شاہدہ بیگ گیٹ پر کھڑی اس کا

انتظار کر رہی تھیں۔ تیمور گھر میں داخل ہوا۔

''کہاں رہ گئے تھے۔ مجھے لگا شاید تم واپس نہ آؤ۔''

''نہیں بس ہوٹل پر دیر ہو گئی تھی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اپنے گھر نہ آتا تو کہاں جاتا۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تیمور کی بات سن کر شاہدہ بیگ حیران رہ گئیں۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

وہ اس کے لیے فکر مند تھیں۔ اتنے سال جیل میں رہ کر اس کے ذہن پر کیا اثر پڑا ہوگا۔ جب پہلے ساتھ میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اس سے سوتیلوں جیسا سلوک کیا تھا۔ اس کے لیے کھانا گرم کر کے میز پر لگایا۔ وہ فریش ہو کر نیچے آیا۔

''آپ نے کھانا نہیں کھایا۔'' کرسی پر آلتی پالتی مار کے بیٹھا۔

''نہیں، میں اس وقت کھانا نہیں کھاتی۔ تم بتاؤ آج کا دن کیسا رہا۔'' وہ بھی پاس بیٹھ گئیں۔ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' اس نے پانی کا گھونٹ پیا۔ ''اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ میرے لیے دعا کرنا۔ اللہ ماؤں کی دعا بہت جلد سنتا ہے۔''

''ماں'' کا لفظ سن کر شاہدہ بیگ پھر حیران ہوئیں۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ کاش وہ بری ماں نہ بنتی۔ اپنے گھر پر توجہ دیتی۔ آج یہ سب نہ ہوتا۔

''وہ سر کہہ رہے تھے۔ اس بار جام کی سو بوتلیں چاہئیں۔''

''میری بھی ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ آج پچاس بوتلیں تیار کر لی ہیں۔ کل پچاس اور تیار ہو جائیں گی۔''

''میں آپ کے لیے کچھ لایا تھا۔'' تیمور نے اپنی جیب سے ایک پیکٹ نکال کر کھانے کی

میز پر رکھا۔

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے پیکٹ کو کھولا۔اس میں جو تھا اسے دیکھ کر شاہدہ بیگ تو شاکڈ رہ گئیں۔''یہ تم۔''

''مجھے آپ کا فیورٹ کلر نہیں پتا تھا۔'' اس نے روٹی کا آخری لقمہ لیا۔

''تم میرے لیے نیل پالش لائے ہو۔سچ میں۔'' وہ ہنسنے لگیں۔''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کیا بولوں۔ویسے تو میں نے نیل کلر لگانا چھوڑ دیا ہے۔پر اسے سنبھال کر رکھوں گی۔''

''میں اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لوں۔صبح پھر جلدی نکلنا ہے۔'' وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شاہدہ بیگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔نیل کلر اپنی الماری میں سنبھال کر رکھ لیا۔برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئیں۔اب وہ بھی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی تھیں۔عشاء کی نماز کے لیے وضو کیا،عشاء کی نماز ادا کی۔تیمور کے لیے اب دعا بھی مانگتی تھیں۔آخرکار وہ ان کا بیٹا تھا۔

☆......☆......☆

آج صبح سے طوفانی ہوا چل رہی تھی۔آدھے سے زیادہ آسمان کالا تھا۔تیز ہواؤں کے ساتھ مٹی بھی اڑ رہی تھی۔موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔

گیٹ پر زوروں کی دستک ہوئی۔تیمور بڑے بڑے ڈگ بھرتا گیٹ تک پہنچا۔گرد آلود ہواؤں سے بچنے کے لیے اپنے پورے چہرے کو سفید رومال سے کور کیا۔پھر اس نے گیٹ کھولا۔

اس نے جینز کی پینٹ کے اوپر جامنی رنگ کا کرتہ پہنا ہوا تھا۔دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے کپڑے کے بیگ تھے۔دوپٹہ ہوا سے اڑ رہا تھا۔

''میڈم کہاں رہ گئی ہیں۔اتنا بھاری سامان اٹھا کر میری تو جان نکلنے جا رہی ہے۔'' وہ اپنا

دوپٹہ سنبھالتی سامان اٹھا کر سیدھا اندر داخل ہوئی۔

''کون ہو۔میرے گھر میں کہاں گھستی جارہی ہو۔'' تیمور نے دروازہ بند کیا۔

''تم کون ہو؟ زومی۔یہ میری میڈم کا گھر ہے۔میڈم۔میڈم۔'' وہ اونچی آواز سے چلانے لگی۔سامان اندر زمین پر رکھا۔

''کون ہے......ستارہ؟'' شاہدہ بیگ کچن میں سبزی کاٹ رہی تھیں۔وہ چھری لے کر باہر آئیں۔

''دیکھیں ہمارے گھر کون گھس آیا ہے۔'' تیمور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا۔

''میڈم! یہ زومی کون ہے۔اور آپ نے اپنے ہاتھ میں یہ چھری کیوں پکڑی ہے۔'' ستارہ ہانپتی کانپتی صوفے پر بیٹھی۔دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

''ستارہ! ایک منٹ سانس لے لو۔پہلی بات میں سبزی کاٹ رہی تھی۔اور یہ میرا بیٹا ہے تیمور۔'' انہوں نے تیمور کی طرف اشارہ کیا۔''اور تیمور بیٹا، یہ ستارہ ہے۔''

''اچھا وہ اپیل جام والی۔'' تیمور فٹ بولا اور سیڑھیاں پھلانگتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''کیا مطلب جام والی۔''

''کچھ نہیں۔تم میرے ساتھ مل کر جام جو بناتی ہو۔یہ بتاؤ کام ختم ہوگیا۔'' وہ کچن میں داخل ہوئیں۔

''جی شکر ہے آرڈر پورا تیار ہے۔'' وہ اپنے بیگ سے ٹفن نکال کر باہر لائی۔گھور کر سیڑھیوں کو دیکھا اور پھر کچن میں داخل ہوئی۔''یہ امی نے آپ کے لیے پکوڑے اور کڑی بھیجی ہے۔'' اس نے برتن شیلف پر رکھے۔

''ہوں۔مجھے پکوڑے بہت پسند ہیں۔'' انہوں نے چاولوں کو ابلتے پانی میں ڈالا۔''میں

چائے بناتی ہوں۔پھر آرڈر دینے جائیں گے۔"

"میں پہلے آرڈر دے آؤں۔ٹینشن ختم ہو جائے گی۔آ کر چائے پیوں گی۔رکشہ والا باہر ہی کھڑا ہے۔گلی میں پانی دیکھ کر کہہ رہا تھا میرا نیا رکشہ گندہ ہو جائے گا۔اس لیے مجھے یہاں تک پیدل آنا پڑا۔"اس نے اپنے دوپٹے کو پن کیا۔

"اس موسم میں اکیلی کیسے جاؤ گی۔میں تیمور کو تمہارے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔"

اس سے پہلے ستارہ انہیں منع کرتی۔شاہدہ بیگ نے تیمور کو آواز دے دی۔وہ بلیک ٹراؤزر اور ہلکے رنگ کی شرٹ پہن کر نیچے آیا۔

"تم دونوں ساتھ چلے جاؤ۔"

"پر مجھے آج چھٹی ہے۔اور مدرسے سے مجھے بہت کام ملا ہے۔"وہ ہاتھ باندھ کر کچن میں کھڑا تھا۔

"پلیز۔بس سامان دے کر واپس آ جانا ہے۔میری دوست نے آنا ہے۔"رائتہ بنانے کے لیے کھیرا کدوکش کرنے لگیں۔"ابھی حلیمہ آتی ہو گی۔"

تیمور نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو جام کی بوتلوں کو دوبارہ گن رہی تھی۔وہ منہ بسورتا ہوا باہر نکل گیا۔ستارہ بھی اس کے پیچھے سامان لے کر نکل پڑی۔ان کے جاتے ہی پروفیسر حلیمہ آ گئیں۔

"میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔تمہارا بیٹا واپس آ گیا ہے۔اور سب سے اچھی بات تمہارے ساتھ رہ رہا ہے۔"وہ اپنا برقعہ اتار کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔دو ماہ ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے۔آج پہلے دن کام سے چھٹی کی تھی۔"انہوں نے بریانی کی ڈش میز پر رکھی۔

"اور تم نے اسے پھر کام پر بھیج دیا۔"پروفیسر حلیمہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"میں ایک بات سوچ رہی تھی۔اگر۔" وہ بھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"بولو کیا بات ہے۔" ان کے ماتھے پر بل پڑے۔

"اگر ستارہ اور تیمور۔"

"ایک ہو جائیں۔" پروفیسر حلیمہ فٹ سے بولیں۔ "ابھی دونوں ساتھ میں نکلے تھے۔ان کو دیکھ کر میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا۔میرے خیال میں دونوں ایک دوسرے کے لیے پرفیکٹ رہیں گے۔اور ان دونوں نے اپنی زندگی میں کافی تکلیفیں دیکھی ہیں۔تم نیک کام میں دیر مت کرنا۔"

"تم نے میری مشکل آسان کر دی۔میں پہلے تیمور سے بات کر لوں۔تم ایسا کرو ستارہ سے بات کر لو۔وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گی۔" انہوں نے خوشی سے گہری سانس لی۔ "پھر میں ستارہ کے گھر والوں سے بات کروں گی۔" انہوں نے بریانی پلیٹ میں ڈال کر حلیمہ کو دی۔

شاہدہ بیگ کو تسلی تھی، تیموران کی بات نہیں ٹالے گا۔وہ اسے شادی کے لیے منا لیں گی۔ پر زیادہ مسئلہ ستارہ کے گھر والوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔تیمور کا جیل جانا۔شاید وہ انکار کر دیں۔پر اگر حلیمہ ستارہ کو شادی کے لیے راضی کر لے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔پروفیسر حلیمہ کے دماغ میں ایسے ہی خیالات چل رہے تھے۔

پروفیسر حلیمہ کے بات کرنے پر ستارہ نے شادی سے انکار کر دیا۔جو پہلے اس کے ساتھ دو بار ہو چکا تھا۔وہ اب شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔پر یہ پروفیسر حلیمہ ہی تھیں۔جنہوں نے اسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔

شاہدہ بیگ نے جب تیمور سے شادی کے لیے بات کی۔ان کی توقع کے برعکس اس نے شادی کے لیے ہاں کہہ دی۔اور یہ سب قرآن کی تعلیم کی وجہ سے ہوا تھا۔تیمور کو اپنے پاؤں پر

کھڑے ہونے اور ماضی سے نکلنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔

تیمور اور ستارہ کی شادی ایک سال بعد کر دی گئی۔اس کے دونوں چھوٹے بھائی بھی جرمنی سے واپس آ گئے تھے۔

ایک صبح تینوں بھائی باہر صحن میں بیٹھے تھے۔وہ تینوں شکیل رضا کی قبر سے ہو کر آئے تھے۔

ستارہ کچن میں چائے بنا رہی تھی۔شاہدہ بیگ ان بچوں کے لیے کیک بنا رہی تھیں۔

”بھائی! ہم نا بچپن میں آپ کے بڑے فین تھے۔“موسیٰ رضا اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

”مطلب۔فین تھے۔میں کوئی سنگر تھا، ایکٹر تھا۔کس بات کے فین تھے۔“ تیمور ان دونوں کے درمیان میں بیٹھا تھا۔

”ویسے ہی۔جیسے آپ نے پہلے لمبے بال رکھے تھے۔بڑے بڑے شوز پہنتے تھے۔آپ کا اپنا سٹائل تھا۔“عیسیٰ رضا نے بھی اپنے بھائی کی بات سے اتفاق کیا۔

”اچھا۔اور۔“ تیمور سر جھکائے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں جکڑ کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”آپ جیسا کوئی نہیں تھا۔مجھے معلوم ہے آپ کے سارے دوست آپ سے جیلس ہوتے تھے۔“عیسیٰ رضا پھر بولا۔

”اچھا۔اور۔“

”ہاں بھائی، وہ سب آپ کو کاپی کرتے تھے۔ہمارے کسی فرینڈ کا بھائی اتنا کول نہیں تھا۔“موسیٰ رضا بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

”اچھا۔اور۔“

”اگر آپ فلموں میں کام کرتے تو آج ٹاپ کے ہیرو ہوتے۔“موسیٰ رضا پھر بولا۔

''اچھا۔اور۔''

''آپ نااس سٹائل میں پورے ایک کارٹون کریکٹر کی طرح لگتے تھے۔''عیسیٰ رضا فخریہ بولا۔

''مطلب۔''تیمور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہاں ہاں،اس ہیئر اسٹائل میں آپ پورے ایک کارٹون کی طرح لگتے تھے۔''موسیٰ رضا نے اپنے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔

''نالائقو۔''انہوں نے ان دونوں کے کانوں کو کھینچا۔''میں تم دونوں کو کارٹون لگتا تھا۔''

''نہیں،نہیں ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔''وہ تینوں ہنسنے لگے۔

''کارٹون نہیں ہیرو۔''شاہدہ بیگ بھی اپنی اولاد کو ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

تیمور ہوٹل پر چائے بنا رہا تھا۔اللہ نے اس کے ہاتھوں میں واقعی بہت برکت ڈالی تھی۔ گاہکوں کو اس کی چائے بہت پسند آتی تھی۔اکثر لوگ صرف چائے پینے اس کے ہوٹل آتے تھے۔ان کا ہوٹل کافی مشہور ہو گیا تھا۔اس کا منیجر اور باس اس سے بہت خوش تھے۔

سردیوں کی اس رات تیمور ہوٹل کے کچن سے چائے بنا کر کسی کام سے باہر آیا۔وہ ہوٹل کے ویٹر سے بات کر رہا تھا۔جب کسی نے اسے پیچھے سے پکارا۔جب وہ مڑا تو اس کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔اس کے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔کیپری ٹراؤزر کے اوپر پھنسی ہوئی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔گرم کوٹ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔اس نے اپنے گلاسز اتارے۔

''تم تیمور رضا ہو نا۔''

''ہاں میں تیمور رضا ہاشمی ہوں۔''تیمور اپنے دونوں بازو سینے سے باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

''تم جیل سے باہر آ گئے۔''کرسٹل اپنی انگلی اس کی طرف کرتے ہوئے نخرے سے

بولی۔ ''تو تمہاری سٹپ مدر کے بھائی نے تمہارے پاپا کو قتل کیا تھا۔اور تم فالتو میں اتنے سال جیل میں رہے۔ہوں۔''

''سچ کبھی نہ کبھی سامنے آجاتا ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تم تو امریکہ جانے والے تھے۔سب سے اونچی بلڈنگ میں فلیٹ لینا تھا۔جہاں سے تمہیں سب چھوٹے نظر آتے۔اور اب ادھر ہوٹل میں۔چچی۔چچی۔تمہارے تو پر ہی کٹ گئے۔'' اپنے گلاسز بیگ میں ڈالے۔

''اونچا اڑنا کوئی مشکل نہیں۔ویسے تمہاری وہ ریکارڈنگ اب بھی میرے پاس پڑی ہے جس میں تم میرے پاپا سے پیسے اور پیپرز مانگ رہی ہو۔ویسے میرے پاس وہ ریکارڈنگ بھی ہے جس میں تم اور وسیم میرے پاپا کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہو۔وسیم نے خود دی تھی۔کہتی ہو تو کل لا دوں گا۔''

اس کی باتیں سن کے کرسٹل کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا ہینڈسم۔وہ بدلا نہیں تھا، میں تیمور رضا ہاشمی آج بھی اس کی زبان پر تھا۔کرسٹل خاموشی سے وہاں سے نکل گئی۔

تیمور واپس کچن میں آیا۔آج ڈیلیوری کی وجہ سے ستارہ ادھر ہی تھی۔اس نے ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔تیمور نے بھی یہ بات نوٹ کی۔اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ دربار شریف لے گیا۔

''تمہیں پتا ہے جب بھی میں اداس یا پریشان ہوتا ہوں۔ادھر آجاتا ہوں۔یہاں مجھے بہت سکون ملتا ہے۔'' وہ اکبر کے پاس چائے پینے بیٹھے تھے۔

''یہ جگہ سچ میں بہت پیاری ہے۔'' ستارہ گرم کوٹ پہنے دربار کو دیکھ رہی تھی۔دربار شریف

پر ہمیشہ کی طرح رش تھا۔مختلف لائٹس سے دربار بہت سجا ہوا تھا۔گلاب اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔رات کے وقت بھی ایسا لگتا تھا جیسے دن چڑھا ہو۔

''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں وہ لڑکی کون تھی؟''

ستارہ نے کوئی جواب نہ دیا۔بس خاموشی سے دربار کو دیکھتی رہی۔

''میری کچھ نہیں تھی۔میں نے کبھی لڑکیوں سے دوستی نہیں کی۔بس ہمارے گروپ میں تھی۔میرے پاپا نے مجھے یہی سکھایا تھا لڑکیوں سے کبھی دوستی مت کرنا۔میں نے ان کی اس بات پر عمل کیا تھا اور آج خوش ہوں۔''

''میں نے تم پر شک نہیں کیا تھا۔بس پتا نہیں کیوں ڈر گئی تھی۔'' اپنے ہاتھ آپس میں مسلتے ہوئے بولی۔

''ہماری زندگی بہت بے ترتیب رہی ہے۔ایک دوسرے کے ساتھ سے انشاءاللہ ترتیب میں آجائے گی۔اگر میں قرآن کا ترجمہ نہ پڑھ رہا ہوتا تو شاید اب تک بالکل تباہ ہو جاتا۔قرآن نے مجھے روشنی دکھائی ہے۔میری تکلیفوں کو کم کیا ہے۔میرے ہر سوال کا جواب دیا ہے۔اور۔'' اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔''مجھے ایک اچھی بیوی دی ہے۔''

اس کی بات سن کے ستارہ ہنس پڑی۔''آج میری تعریف کرنا کہاں سے یاد آگیا۔''

''بس اس لیے تمہاری تعریف نہیں کرتا۔تم سیریس نہیں لیتی مجھے۔'' وہ خفا ہوا۔

''سوری مذاق کر رہی تھی۔جب میں اندھیروں میں تھی۔سچ میں قرآن نے مجھے روشنی دکھائی تھی۔مجھے سیدھا راستہ دکھایا تھا۔''

''ستارہ! مجھ سے ہمیشہ سچ بولنا۔اس لیے میں چاہتا ہوں۔تم اپنا خواب پورا کرو۔ایک بہت اچھی ٹیچر بنو۔اپنی پڑھائی پوری کرو۔موسیٰ اور عیسیٰ دونوں نے وکیل بننا ہے۔کہتے ہیں

ہم اکبر جیسے بچوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔اللہ ان دونوں کو کامیاب کرے۔ستارہ۔ہم سب مل کر مینج کرلیں گے۔''اس نے ایک گجرے والے سے اپنی بیگم کو پھول خرید کر دیے۔ستارہ نے پھولوں کو سونگھا۔ان پھولوں کی خوشبو سچ میں بہت پیاری تھی۔

☆......☆......☆

''میں اس سکول کی پرنسپل ہوں۔آپ سب کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔بس صرف سچ بولوں گی۔''

سکول گراؤنڈ سٹوڈنٹس کی ماؤں سے بھرا ہوا تھا۔شاہدہ بیگ بھی اپنے پوتی اور پوتے کے ساتھ وہاں سب سے آگے بیٹھی تھیں۔سکول کی پرنسپل نے کلرک کو اشارہ کیا۔اس نے اونچی آواز میں ایک ویڈیو چلائی۔ویڈیو میں ایک بچے کی چیخ تھی۔چیخ کی آواز سن کر پورے گراؤنڈ میں خاموشی چھا گئی۔

''آپ سب مائیں کبھی نہیں چاہیں گی کہ کل کو خدانخواستہ آپ کا بچہ اس درد سے گزرے۔جی میں بچوں سے ہونے والی زیادتی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔گڈ ٹچ اور بیڈ ٹچ۔کیا کبھی سنا ہے آپ نے اس بارے میں اپنے بچوں کو سمجھائیں کہ اگر کوئی آپ کے جسم کو غلط طریقے سے چھوتا ہے تو وہ آپ سے بات کریں۔خاموش نہ رہیں۔ایسا کرنے سے ان غلیظ لوگوں کی ہمت اور بڑھے گی۔اپنے بچوں کی حفاظت خود کریں۔انہیں محرم اور نامحرم میں فرق بتائیں۔آپ کو پتہ ہے بہت سارے زیاتی کے کیس میں زیادہ تر مجرم قریبی لوگ ہوتے ہیں۔''

''اپنے بچوں پر سختی کریں۔جب بھی گھر سے نکلیں وضو کر کے نکلیں۔آیت الکرسی پڑھ کر گھر سے باہر قدم رکھیں۔آپ اپنے بچوں کی حفاظت خود کریں۔کسی پر بھی بھروسہ نہ کریں۔میں آج پرنسپل کی جاب چھوڑ رہی ہوں۔میرے بچوں کو میری ضرورت ہے۔ایک ماں کا پہلا

کام بچوں کی تربیت کرنا ہے۔میں آپ سب سے درخواست کروں گی۔پلیز اپنے بچوں پر توجہ دیں۔ان کی اچھی تربیت کریں اللہ آپ سب کی حفاظت کرے۔"

ستارہ سٹیج سے نیچے اتر آئی۔اس کے دونوں بچے اپنی ماں کے پاس بھاگ کر آ گئے۔شاہدہ بیگ اپنی بہو کے لیے بہت خوش تھیں۔سٹاف کی باقی ٹیچرز ان کے جانے سے دکھی تھیں۔وہ بہت اچھی پرنسپل تھیں۔

"تم کو جاب نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ہم مل کر مینج کر تو رہے تھے۔"

"پہلے گھر بعد میں کچھ اور۔اگر میں ایک اچھی ماں نہ بن سکی تو ایک اچھی پرنسپل کیسے بن سکتی ہوں۔"

تیمور اور ستارہ دونوں مری کے ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ہوٹل کی کھڑکی سے پورا مری نظر آتا تھا۔ان کے دونوں بچے پلے ایریا میں کھیل رہے تھے۔ان کی شادی کو آٹھ سال ہو چکے تھے۔ان آٹھ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا دونوں وکیل بن گئے تھے۔تیمور نے بھی قرآن کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا۔وہ اس فوجی کے مری والے ہوٹل میں مینیجر کی جاب کر رہا تھا۔ستارہ بھی بچوں کے ساتھ مری میں رہتی تھی۔اس کے انڈر بہت سے ورکرز کام کر رہے تھے۔ان کا ہوٹل پہاڑوں پر تھا۔جہاں سے پورا شہر نظر آتا تھا۔

"کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہے ہیں۔" ستارہ نے چاولوں کا چمچ منہ میں ڈالا۔

"اللہ نے میرا خواب پورا کر دیا۔امریکہ نہ سہی پاکستان ہی سہی۔میں ایک اونچی جگہ پر جاب کرتا ہوں۔میرے انڈر بہت سے لوگ کام کرتے ہیں۔پاپا کے آخری الفاظ مجھے اب بھی یاد ہیں۔انہوں نے کہا تھا جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔اس ہی سے اپنی زندگی کو سنوارنا۔اور جو تمہارے پاس نہیں ہے۔اس کے پیچھے مت بھاگنا۔"

”اللہ نے میرا خواب بھی پورا کر دیا۔ پروفیسر نہ سہی پرنسپل ہی سہی۔ اللہ کا شکر ہے میں اچھی پرنسپل بنی۔ میرے سٹوڈنٹس اب بھی مجھے یاد کرتے ہیں۔“ وہ فخر سے بولی۔ ”بس اللہ مجھے ایک اچھی ماں بھی بنائے۔“

”پاپا! آئس کریم کھانے چلیں۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ماما نے دو آئس کریم کھانی ہیں۔“

ان کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔

”چلو ابھی چلتے ہیں۔ اور وعدہ توڑنا بہت بری بات ہے۔“ تیمور اپنی کرسی سے اٹھا۔ کرسی کی پشت سے اپنا کوٹ اٹھا کر پہنا۔ وہ اپنی گاڑی پر آئس کریم کھانے کے لئے گئے۔ ان کے بچے بہت خوش تھے۔

”آپ نہ اپنی نظریں نیچے رکھا کریں۔“ ستارہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”مطلب۔“ تیمور گاڑی موڑتے ہوئے حیران ہوا۔

”وہ سڑک سے جو لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ وہ آپ کو دیکھ رہی تھیں۔“ اس نے اپنے شوہر کو گھورا۔

”ہاہاہا۔“ تیمور قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ”توبہ کتنا شک کرتی ہو۔ میں تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتا۔“

ستارہ نے پھر اسے گھورا۔ اب کی بار وہ صرف مسکرایا۔ اس نے گاڑی آئس کریم کی دکان کے باہر کھڑی کی اور اپنی فیملی کو آئس کریم لے کر دی۔ اسے صرف ایک بات کا دکھ تھا۔ کاش وہ اپنے باپ سے آخری بار گلے مل لیتا۔

...... ختم شد ......